

10/6/55

:- HINDI LIBRARY :-
R-25, G. B. Pant Library, Delhi
No. 361 Date 10-6-55

کتاب

:- HINDI LIBRARY :-
R-25, G. B. Pant Library, Delhi
No. 361 Date 10-6-55

سالانہ چنید پاکستان ہندوستان
آٹھ روپیہ چھ آنے (مع سالنامہ)

ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ
قیمت فی کاپی
۱۰/-

تصانیف نیاز فتحپوری

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں نقل کئے گئے۔ اس ادیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے ادیشنوں میں نہ تھے اسلئے شخصیات بھی زیادہ سے قیمت چار روپے علاوہ محصول

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کیلئے

ختم کرنے والی انجیل انسانیت

من ویرداں

مولانا نیاز فتحپوری کی ۳۳ سالہ دور تصنیف و عیانت کا ایک غیر خانی کا زمانہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع انسانی کو انسانیت کبریٰ و اخوت عامہ کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے جس میں مذاہب کی تخلیق دینی عقائد رسالت کے مفہوم اور صحائف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطہ نظر نہایت بلند انشائیاں اور بہ روز خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے قیمت سات روپے آٹھ آنے علاوہ محصول

جمارستان

ادبی نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان، قدرت حیالات اور پاکیزگی زبان کے بہترین نمونے ہماروں کے علاوہ بہت اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل بھی نظر آئے گا ہر افسانہ ہر مقالہ اپنی جگہ معجزہ ادب کی حیثیت رکھتا ہے اس ادیشن میں انسانی اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے ادیشنوں میں نہ تھے قیمت پانچ روپے آٹھ آنے علاوہ محصول

حسن کی عیالیاں

اور دوسرے افسانے حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور اشارہ لطف کا بہترین مزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر روشن ہوگا کہ تاریخ کے پھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں جنہیں حضرت نیاز نے افسانوں اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے قیمت پانچ روپے آٹھ آنے علاوہ محصول

مذہبی استفسارات جوابات کا

مجموعہ

اس مجموعہ میں جن مسائل پر حضرت نیاز نے رد و ثبات دی ہے ان کی مختصر فہرست یہ ہے (۱) صحابہ کرام (۲) معجزہ و کرامت (۳) انسان مجبور ہے یا مختار (۴) مذہب و عقل (۵) طوفان نوح (۶) خضر کی حقیقت (۷) مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں (۸) یونس بارون (۹) حسن دوست کی داستان (۱۰) قارون (۱۱) سامری (۱۲) علم غیب (۱۳) دعا (۱۴) توبہ (۱۵) لقمان (۱۶) عالم بلیغ (۱۷) یاجوج ماجوج (۱۸) ہاروت ماروت (۱۹) حوض کوثر (۲۰) امام ہمدانی (۲۱) نور محمدی اور پل صراط (۲۲) آتش نرود وغیرہ صفات ۶۲۳ صفحات کا غز سفید۔ سینر قیمت پانچ روپے آٹھ آنے

ترغیبات جنسی یا

شہوانیات (مجلد) اس کتاب میں نجاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات پر تاریخی و نفسیاتی حیثیت سے نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے کہ نجاشی دنیا میں کیا وہ کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اس کے راج میں کتنی بدد کی اس کتاب میں ایک حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔ نیا ایڈیشن قیمت چار روپے آٹھ آنے علاوہ محصول

آئندہ جولائی ۱۹۵۵ء کا "نگار" حاصل کرنا نہ بھولئے

جس میں

سالنامہ "نگار" ۱۹۵۵ء

(علماء اسلام و علوم اسلامی نمبر)

کا تہہ شایع ہو رہا ہے اس میں ان ۱۲۵ علماء اسلام کا تذکرہ درج ہوگا جن کا ذکر سالنامہ میں نہ ہو سکا تھا۔ ان علماء میں بعض کے نام یہ ہیں :-

کلبی - عطار - فاسی - سکاری - شریف رضی - طبری - حلاج حیدر رازی - خازنی - حمزہ اصفہانی - ابن ہشام باجوری - ترمذی - تلمسانی - نعمت خان عالی - سید محمد جنپوری - جبری - نظام بدخشی - ابن الراوندی - قرۃ العین - دارقطنی وغیرہ علاوہ ان کے بہت سے ہندی علماء کا بھی ذکر ہوگا۔

اگر آپ نگار کے مستقل خریدار نہیں ہیں اور صرف سالنامہ ۱۹۵۵ء حاصل کیا ہے تو بھی اس پرچہ کو ضرور حاصل کیجئے۔ اس تہہ کو آپ نکال کر سالنامہ میں شامل کر سکتے ہیں۔

منیجر

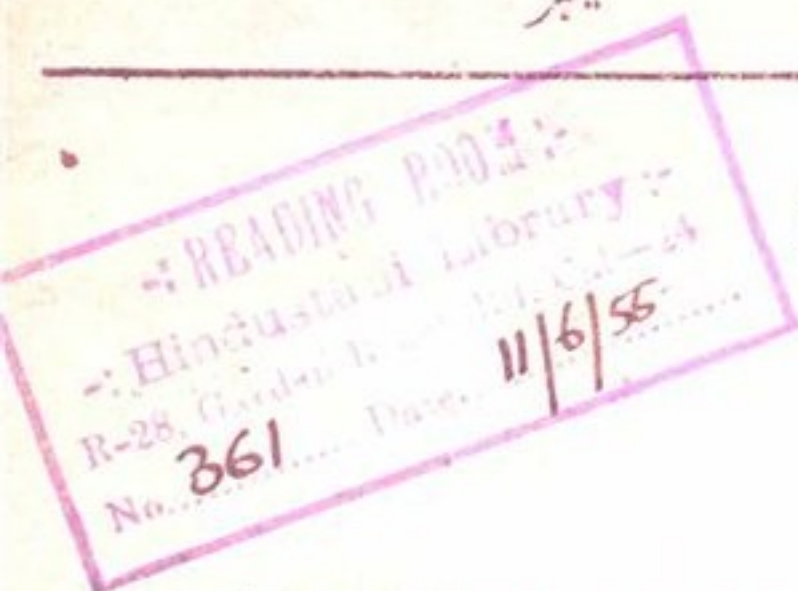
سالنامہ ۱۹۵۶ء

"خدا نمبر"

چھ حصوں میں تقسیم ہوگا :

- حصہ اول : مذہب کا خیال کب اور کیوں پیدا ہوا اور عہد تاریک سے گزر کر نیم مذہب اقوام نے خدا کا تصور کس کس طرح کیا۔
- حصہ دوم : مل قدیمہ اور سامی اقوام میں، مصری، بائبل و آشوری، خنیتی، یہودی، عیسائی مذاہب اور اسلام کا تقابلی مطالعہ۔
- حصہ سوم : آریہ مذاہب میں یونانی، رومی، ٹیوٹائی، کیلٹی، فارسی، ہندو، بودھی، جینی اور سکھ اقوام نے خدا اور مذہب کو کس نقطہ نظر سے دیکھا۔
- حصہ چہارم : امریکہ کی مایا اور دوسری غیر مذہب اقوام نے خدا کو سمجھنے کی کیا صورتیں اختیار کیں۔
- حصہ پنجم : عقل و مذہب کی جنگ، روایت و درایت کا تصادم اور الحاد و لاد مذہبیت کا ارتقاء۔
- حصہ ششم : تمام ابواب پر مفصل تبصرہ۔

منیجر نگار



سالنامہ کو ذریعہ رجسٹری روانہ کرنے کے لئے

ہر سال ہم کو چھ آنے طلب کرنا پڑتے ہیں

اور جو حضرات ذریعہ رجسٹری طلب نہیں کرتے ان میں سے بعض کا سالنامہ گم ہو جاتا ہے جس کا ہم کو سخت افسوس ہوتا ہے اس لئے مناسب یہ ہے کہ مصارف رجسٹری سالانہ چندہ کے ساتھ ہی وصول کر لئے جائیں اور خریداران نگار کو دوبارہ چھ آنے بھیجنے کی زحمت گوارا نہ کرنا پڑے۔
پھر باقی آپ ذریعہ منی آرڈر سالانہ چندہ آٹھ روپیہ چھ آنے روانہ فرمائیے یا آٹھ روپیہ آٹھ آنے کے بجائے آٹھ روپیہ چودہ آنے کا دی، پنی قبول کیجئے۔ منیجر

تصانیف نیاز فحشوری

ایمانی قمر

ایمانی قمر

من ویزوال مذہبی استفسارات و جوابات جمستان نگارستان شہوانیات
مکتوبات نیازتین حصے انتقادات حسن کی غباریاں مالبہ و ماعلیہ شہاب کی سرگزشت
فلاسفہ قدیم مذاکرات نیاز فرست الید مذہب نقاب آٹھ جانے کے بعد
عمر

میزان
صفحہ ۵۳

تمام کتابیں ایک ساتھ طلب کرنے پر مدد محمول صرف چالیس روپیہ میں اخیر جولائی تک
منیجر نگار لکھنؤ

پاکستان میں نگار اور مطبوعات نگار

اگر ہاں تک کسی ماہ کا پرچہ آپ کو نہ ملے

ان پتوں سے حاصل کیجئے :-
۱۔ کتاب محل کراچی - ۲۔ اقبال بک ڈپو - کراچی
۳۔ کتب - راولپنڈی
۴۔ ہاسٹی برادرز بکسیلر کوئٹہ بلوچستان
۵۔ مکتبہ جدید لاہور

تو اطلاع ملے پر آئندہ ماہ کے پرچہ کے ساتھ ہم اپنے صرف سے فراہم کر دیں گے
لیکن اگر آپ اس سے قبل چاہیں گے تو ہیزنگ روانہ ہونا (کیونکہ مینے کے
اندر اندر پیڈ بھیجنے میں ہم کو گنا محمول ادا کرنا ہوگا) اس لئے جب آپ
پرچہ نہ پہنچنے کی اطلاع دیں تو ضرور لکھ دیجئے کہ آپ فوراً چاہتے ہیں
یا اگلے پرچہ کے ساتھ۔ منیجر نگار

آئندہ جولائی ۱۹۵۷ء کا "نگار" بہت اہم ہے کیونکہ اس میں سالنامہ ۱۹۵۷ء کا تتمہ شائع ہوگا

کہ آپ کا چندہ جون میں ختم ہو گیا اور جولائی کا "نگار" ۱۹۵۷ء کی قیمت (مع مصارف رجسٹری) بھی شامل ہے

نگار

دوہنی طرف کا ٹیلیپی نشان علامت ہے اس امر کی آٹھ روپیہ چودہ آنے میں دی جی ہوگا جس میں سالنامہ

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

شمار ۶

فہرست مضامین جون ۱۹۵۷ء

جلد ۶۶

۳۶ شوپن ہائر کا نفسیاتی تجزیہ طالب صفوی
۴۱ گاہے گاہے بازخوان (مذہب کا زاویہ نگاہ)
۴۵ ہندوستان کے مسلم دور حکومت کی چند نامور خواتین
۵۰ معلومات
منظومات پروفیسر شورش، فضا ابن فیضی، نور جہاں نصرت
۵۳ حکیم احمد، شفقت کاظمی، حیات لکھنوی، نسیم

۳ ملاحظات
۵ ادب میں شخصیت (ڈاکٹر) شوکت مہزوری
۱۲ شیفہ کی اردو شاعری پروفیسر ارشد کوی
۱۹ فن تحریر کی تاریخ محمد اسحاق صدیقی
۲۵ مولانا شاد عظیم آبادی کا ایک مکتوب
۳۶ کچھ گنجے فرشتے کے بارے میں پروفیسر نظیر صدیقی

ملاحظات

پاکستان — مرد بیمار

سلطنت عثمانیہ کا آخری دور ترکی حکومت کا انتہائی انحطاطی دور تھا اور حالات اس درجہ نازک ہو گئے تھے کہ دنیا اسے

"مرد بیمار" کے نام سے یاد کرنے لگی تھی، پھر محض اتفاق تھا کہ اسی وقت ایک "مرد غیب" کمال اتاترک سامنے آگیا اور اُس نے اس "مرد بیمار" کو موت سے بچا لیا، ورنہ ہمیشہ ہوتا یہی ہے کہ جب کوئی قوم انحطاط کی اس منزل تک پہنچ جاتی ہے تو پھر بچتی نہیں اور فنا ہو جاتی ہے لیکن یہ منزل دفعتاً نہیں آ جاتی بلکہ اُس وقت سامنے آتی ہے جب کافی زمانہ تک حکومت کرنے کے بعد حکمران افراد "تبیخ و سنان" چھوڑ کر "چنگ و رباب" ہاتھ میں لے لیتے ہیں — پاکستان کے باب میں ایسا ہی بالکل نیا تجربہ ہے کہ آٹھ سال کے اندر ہی دفعتاً اس منزل انحطاط پر پہنچ گیا جہاں دوسری قومیں صدیاں گزرنے کے بعد آہستہ آہستہ پہنچتی ہیں اور وہیں آہستہ ہی وہ غلیل و بیمار ہو گیا، یہاں تک کہ آج اس پر عالم احتضار طاری ہے اور غالباً یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ — "کار از دو واگزشتہ و افسوں نگردہ کس" — کیسی افسوسناک حقیقت ہے، کیسا المناک واقعہ ہے اور کتنی دل دکھا دینے والی بات!

تقسیم ہند کے بعد کچھ زمانہ ضرور پاکستان پر ایسا گزرا کہ ہماری توقعات اس کی طرف سے کافی بلند ہو چکی تھیں، لیکن یہ ہماری غلطی تھی کہ ہم نے اسے خود پاکستان کی عملی جدوجہد کا نتیجہ قرار دیا حالانکہ حقیقت صرف یہ تھی کہ یہ گاڑی کھچلی قوت ہی سے چل رہی تھی اور آخر کار جب وہ قوت ختم ہو گئی تو وہ دفعتاً ایک جگہ آکر رک گئی۔

جنھوں نے قاید اعظم کی وفات کے بعد حالات کا بغور مطالعہ کیا ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ کام کا وہ ڈھرا جو تقسیم سے قبل چلا آ رہا تھا کس طرح آہستہ آہستہ کمزور ہوتا گیا یہاں تک کہ مسٹر محمد علی کے زمانہ میں وہ تقریباً ختم ہو گیا۔

پاکستان اپنے رقبہ، اپنی آبادی اور اپنے وسائل کے لحاظ سے کوئی معمولی ملک نہیں، وہ ایک مضبوط حکومت بننے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے، وہ ہر قسم کی ترقیاں کرنے کے وسائل کا مالک ہے، اپنی جائے وقوع کے لحاظ سے بڑی اہم سیاسی پوزیشن حاصل کر سکتا ہے، لیکن افسوس ہے کہ ان تمام صلاحیتوں سے کام لینے والا وہاں کوئی نہیں یہاں تک کہ آٹھ سال گزر جانے کے بعد بھی اب تک وہاں دستور نہیں بن سکا۔ وہاں کی پارٹی بندی، صوبائی عصبیت نے طبقہ امرا کی خود غرضی و نفس پروری اور ملایانہ ذہنیت، یہ ہیں وہ تمام بلائیں جو اس وقت پاکستان پر مسلط ہیں اور ان سے بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض پودھے کاٹے چھاٹے سے اور زیادہ پنپ جاتے ہیں، تازہ کوٹلیں ان میں پھوٹنے لگتی ہیں، نئے نئے کٹے نکل آتے ہیں اور بعض پودھے از خود خشک ہونے لگتے ہیں اور کانٹ چھانٹ کا بھی ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ بالکل یہی فرق ہندوستان اور پاکستان کا ہے۔ ہندوستان کا پودھا تازہ و شاداب ہوتا جا رہا ہے اور پاکستان کا مر جھانا چلا جاتا ہے۔ محض اس لئے کہ بھارت کے پودھے کو اچھے مالی ہاتھ آگئے ہیں اور پاکستان کے پودھے کا کوئی رکھوالا نہیں۔

بین الاقوامی سیاست میں ہندوستان نے جو اہمیت حاصل کر لی ہے اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ وہ ایک بڑا ملک ہے اور پاکستان جو اپنی ساکھ کھو بیٹھا ہے اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ ہندوستان سے چھوٹا ملک ہے۔ بلکہ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ ہندوستان کو صحیح جمہوریت کا احساس پیدا ہو گیا ہے اور پاکستان اس وقت تک بالکل رقیق حالت میں ہے اور نہیں کہا جاسکتا کہ آئندہ اسے کس سا پچھ میں ڈھلانا ہے۔

پاکستان کی سب سے پہلی اور بڑی اصولی غلطی یہ ہے کہ وہ مذہبی قسم کا دستور بنانا چاہتا ہے۔ حالانکہ موجودہ دور میں اس سے زیادہ ناایمانی بات اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ جمہوریت کے ساتھ مذہب کے تصور کو بھی شامل کیا جائے۔ ایک قوم کوئی مخصوص مذہب رکھ سکتی ہے۔ ایک جماعت کسی مخصوص مسلک کی پابند ہو سکتی ہے۔ لیکن حکومت کا کوئی مذہب نہیں ہوتا اور جمہوریت کی عدالت میں مسجد و مندر کی کوئی تفریق نہیں۔ پھر پاکستان الگ اس بات کا یقین دلائے کہ وہ اقلیتوں کے ساتھ انصاف کرے گا، غیر مسلموں کے حقوق کا تحفظ کرے گا۔ لیکن جب تک اس کے دستور کے ساتھ اسلام کی ضمیمت قائم ہے وہ نہ کبھی غیر مسلموں کو مطمئن کر سکتا ہے، نہ دنیا کی جمہوری برادری میں کوئی عزت اسے حاصل ہو سکتی ہے اور نہ وہ ملایانہ ذہنیت دور ہو سکتی ہے جو ہمیشہ مسلم حکومتوں کے لئے بدترین لعنت ثابت ہوئی ہے۔

دوسری غلطی پاکستان نے یہ کی کہ اس نے حکومت کے ڈھانچے میں عوام کے رابطہ کوئی اہمیت نہیں دی، شروعات ہی سے وہاں کی جماعت اشرف برسر اقتدار رہی اور انھیں جماعتوں کے باہمی انتشار میں انتشار و انقلاب پیدا ہوا اور برابر قائم رہا۔ جب تک وہاں عوام کی حکومت قائم نہ ہو۔ اگر ابتدا ہی میں کوئی دستور بنا کر قوم کے صحیح نمائندوں کو کام کرنے کا موقع دیا جاتا اور مسلم لیگ ذہنیت سے کام نہ کرے۔ خان عبدالغفار خاں ایسے شخص کام کرنے والوں کو قید و بند میں نہ ڈالی دیا جاتا، تو شاید حالات اتنے خراب نہ ہوتے۔

ایک ملک کی ترقی کی اصل بنیاد خود اعتمادی ہے اور اسی چیز کو پاکستان کھو چکا ہے۔ وہ خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ دوسروں کے سپارے سے چلنا چاہتا ہے۔ ذہنیت بڑی نیا دکن ذہنیت ہے۔ اس ذہنیت میں کبھی کبھی وہ خوشامد پر بھی اتر آتا ہے اور جب کبھی اسے اپنی اس ذات کا احساس ہوتا ہے تو نہایت بے معنی شہادتیں بھی کرنے لگتا ہے۔ کبھی وہ کہتا ہے کہ امریکہ کی فوجی امداد کے بعد کشمیر کا مسئلہ آسانی سے سلجھ جائے گا لیکن جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ ہندوستان ان باتوں سے متاثر نہیں ہو سکتا تو وہ خوشامد کرنے لگتا ہے۔ اور امریکی امداد سے دستبردار ہونے کے لئے بھی تیار ہو جاتا ہے۔ افغانستان کے جھگڑے میں وہ ایک وقت آئینیں چٹھا لیتا ہے اور الٹی میٹم دیتا ہے، لیکن جب پاکستان و امریکہ کا دباؤ پڑتا ہے تو سفاهت کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ ان باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ پاکستان اس وقت کبھی مذہب دور سے گزر رہا ہے اور اس کی ذہنی حرکات اسے رفتہ رفتہ گنہگار کر رہی ہے۔

ادب میں شخصیت

اس سے پہلے اُردو میں صرف ادب پارے کو پرکھ کر اس کی قیمت متعین کر لی جاتی تھی۔ ادیب، اس کی شخصیت، ذہن، ماحول، ادب پر سماج کے اثرات نظر انداز کر دئے جاتے تھے۔ ادب پارے کے پرکھنے میں بھی زبان و بیان پر زور ہوتا تھا۔ فصاحت و بلاغت، صنایع و بدایع کو اہمیت دی جاتی تھی۔ خیال اور اس کی اسالیب سے ہم آہنگی اہم نہ تھی۔ آج اسی اگرچہ نقادوں کا ایک گروہ جن میں کروچے، والٹر ہنر اور اسپنگارن بہت نمایاں ہیں صرف ادب پارے پر نظریں جمائے رکھنا چاہتا ہے۔ لیکن عام طور سے جدید تنقید نے اب یہ ضروری ٹھہرایا ہے کہ ادب پارے سے پہلے ادیب اور اس کی شخصیت کا مختلف گوشوں سے مطالعہ کیا جائے اور ان خارجی اسباب و عوامل کا پتہ لگایا جائے جنہوں نے ادیب کی شخصیت کی تعمیر اور ادب پارے کی تخلیق میں حصہ لیا ہے۔ اس کے بغیر ادب پارے کی قدر و قیمت متعین نہیں کی جاسکتی۔ یہ نقطہ نگاہ کی رنگارنگی کا کرشمہ ہے۔ جو لوگ ادب پارے سے نظریں ہٹا کر اس سے وابستہ کسی چیز کو نہیں دیکھتے ان کا نقطہ نگاہ دخل ہے۔ وہ ادب پارے سے جس حد تک متاثر ہوئے اسی حد تک انہیں اس سے دلچسپی ہے۔ زبان کی چاشنی اور طرز بیان کی رعنائی سے انہوں نے لطف لیا اس لئے کلام کے صرف انہیں محاسن کا وہ ذکر کرتے ہیں۔ ادب پارے کے بارے میں ان کے جو تاثرات ہیں ان کا اظہار کر دینے سے ان کے نزدیک ادب پارے کی حیثیت متعین ہو جاتی ہے۔ اس سے زیادہ کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ وہ آم کھاتے ہیں پیڑ نہیں کٹتے۔ اس کے مقابلہ میں دوسرے نقادوں کا نقطہ نگاہ خارجی ہے۔ یہ ایک ایسا سائنس دان کی طرح ادب پارے کی حقیقت اور اس کے نشا و تخلیق کو جاننا چاہتے ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ ادب پارہ کلام میں پیدا نہیں ہوا۔ جس طرح ایک صنعت البھر شخص کو زمرے سے ہوا میں تیرنے نظر آتے ہیں۔ اس نے ایک باشعور ذہن سے جنم لیا ہے۔ پھر ذہن میں بھی وہ پہیلی کی طرح نہیں اُبلتا۔ خاص حالات کے تحت اس کا ظہور ہوا ہے۔ اس کا اس کے خالق کے کردار اور شخصیت سے بڑا اثر اُقلتی ہے۔ جب تک تخلیق کی پوری تاریخ کا علم نہ ہو ادب پارے کی معرفت حاصل نہیں ہوتی اور معرفت کے بغیر اس سے لطف نہیں لیا جاسکتا۔

بہر حال ادب کا ادب سے جو رشتہ ہے تنقید میں اس کی بڑی اہمیت ہے اور اس کا ٹھیک ٹھیک پتہ لگانا آج کے نقاد کے لئے ضروری ہے۔ تیسرے سو دا، مسخفی، انشا، آتش، مسخ، غالب، حالی کی غزلوں میں اسالیب کے لحاظ سے جو فرق ہے اس کا ذکر نقادوں نے کیا ہے۔ ان کی آوازوں کے اختلاف اور رنگارنگی کی طرف توجہ دلائی ہے۔ لیکن یہ کسی نے نہیں بتایا کہ ان شعرا کے کلام میں اسالیب کا یہ فرق اور ان کی آوازوں میں اتار چڑھاؤ کہاں سے آیا۔ وہ کون سے اسباب ہیں جنہوں نے غزل کے روایتی قالب میں رُخسے ہونے کے باوجود حیرت اور غالب کی آوازوں کو الگ الگ رکھا اور کس کی آواز ہوئے نہ دیا۔ تنقید اگر صرف تشریح نہیں تو اسے ان اسباب کا کھوج لگانا چاہئے۔ کسی شاعر کے کلام کی خصوصیات شمار کر دینے سے تنقید کا حق ادا نہیں ہو جاتا۔

شاعر کا کلام اس کی شخصیت کا اُظہار ہوتا ہے جس میں اس کے نام پہلوؤں کی جداگاندہ نظر آتی ہے۔ شخصیتیں مختلف ہیں اس لئے ہر شاعر کا کلام دوسرے سے مختلف ہے۔ ظاہر میں نقادوں کو یہ اختلاف صرف اسالیب میں نظر آیا۔ لیکن شاعر کی شخصیت کے اتنے پہلو ہیں کہ ان کا اسالیب میں سما مشکل ہے۔ ان کے قوس و قزح کے سے رنگوں کی جھلک اسالیب کے علاوہ شعرا کے لب و لہجے، تیور، آواز اور اس کے زیر و بم خیال اور اس کے فکروں کا اور شعر کی فصاحت میں بھی نظر آتی ہے۔ کسی شاعر کے کلام کا مطالعہ اس کی شخصیت کا مطالعہ ہے۔

شعر کی عظمت سے شاعر کی عظمت اور اس کی بلند آہنگ تعمیر سے شخصیت کی بلندی یا استواری کا احساس ہوتا ہے۔ شعر کی عظمت دو طرح کی ہے۔ ایک فنی جو شعر کی صناعت یعنی اس کی ہیئت کی تعمیر میں برقی جاتی ہے۔ اس کی مثال غالب اور ناسخ کا کلام ہے جو تاج محل کے حسن و نفاست کا حامل ہے۔ دوسری عظمت تعمیری ہے جس میں کسی بڑے فکر اور تصور حیات کو اس کے مناسب با عظمت شعری قالب میں ڈھال کر پیش کیا جاتا ہے۔ فردوسی کا شاہنامہ، سنائی کی حلیقہ الحقیقہ، رومی کی مثنوی، خاقانی کے قصیدے، اقبال کا جاوید نامہ، ڈلہی کی کو میڈی ملٹن کی کم کردہ بہشت، تلسی داس کی رامائن، شیکسپیر کے ڈرامے اس کی چند مثالیں ہیں۔ ان کی تعمیر میں شعراء نے تعمیری شعور صرف کیا ہے ان میں فنی عظمت ہی نہیں بلندی تعمیری بھی ہے۔ تاج محل کا حسن اور اس کے شکوہ کے جلوے بھی ہیں، اردو شعراء کے یہاں سلیقہ، نفاست صنعت گری کی کمی نہیں۔ ان کے نقوش میں پھول کی شادائی، پنکھڑیوں کا گزار، نرمی، رنگ ہے۔ لیکن پہاڑ کی عظمت، آسمان کی پہتائی اور دیا کے جوش یا تلاطم کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ ”لوائے جنگ“ تو ہے۔ زور دست و ضربت کاری“ نہیں جس کی ضرورت ہے۔

اردو شاعری کا آغاز دکن سے ہوا۔ یہ اس وقت چھوٹی چھوٹی پانچ یا ستوں میں بٹا ہوا تھا اور مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی طاقت اور متحدہ یورش نے ان کی رہی سہی طاقت کو منتشر کر دیا تھا۔ شمالی ہند میں محمد شاہ کے عہد میں اردو شعر کی زبان کھلی اور وہ بھی دکنی شاعری کے اثر سے۔ ان حالات میں پر شکوہ اور بلند آہنگ شاعر کی بنیاد کیسے استوار ہوگی۔ یہ بڑی حد تک درست ہے۔ لیکن اس زمانہ کی سیاسی مٹی تنہا اس کی ذمہ دار نہیں۔ اگر سیاسی حالات خوشگوار ہوتے اور شاہانہ عظمت کے جلوے دکن یا شمالی ہند میں نظر آتے تو کیا شاہنامے جیسا کوئی کارنامہ وجود میں آسکتا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ شعر کہنے کے لئے ذہنی آسودگی اور شکم سیری ضروری ہے لیکن ذہن آسودہ اور شکم سیر ہو جانے سے ہی شعر نہیں ہو جاتا۔ سیاسی اقتدار اور شاہانہ وقار تنہا پر شکوہ شعری کارنامہ کا ذمہ دار نہیں۔ شاعر کی شخصیت کو بھی اس میں دخل ہے۔ اردو میں با عظمت شخصیت کی کمی رہی ہے اس لئے کوئی بڑا کارنامہ وجود میں نہیں آسکا۔

(۲)

شخصیت نفسیات کا بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے اس لئے تفصیل سے جہاں اس پر نظر ڈالنا چاہتا ہوں۔

شخصیت کی تعمیر میں بہت سے عناصر کارفرما ہیں۔ ظاہری شکل و صورت، اوضاع و اظہار، اخلاق و عادات، اعمال و افعال، سیرت و کردار، ذہن و فکر صلاحیتیں یہ سب خصوصیات یکجا ہو کر شخصیت کی تعمیر کرتی ہیں۔ ہم اپنے احباب اور عزیزوں کو انہی ظاہری خصوصیات سے جانتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ اسپنکار نے کہیں لکھا ہے شخصیت ان خصوصیات کے مجموعے کا نام نہیں۔ وہ ان سے الگ اور آزاد ہے۔ ان خصوصیات میں سے ذہن و فکر کی صلاحیتیں ایک فرد کی شخصیت کی تعمیر میں زیادہ ذخیل میں لیکن یہ بھی شخصیت کی حقیقت میں داخل نہیں اگر شخصیت ان صفات کا نام ہوتا اور ان کے یکجا ہو جانے سے شخصیت وجود میں آتی تو ہر شخص جو چلتا پھرتا، ہنستا بولتا اور شعر کہتا ہے شخصیت کا مالک سمجھا جاتا۔ حالانکہ بہت سے افراد ہیں جو بولنے چاہتے اور لکھنے پڑھنے کے باوجود شخصیت سے محروم ہیں۔ ان میں سے تین قسم کے لوگوں کا ذکر ماہرین نفسیات نے کیا ہے اور لکھا ہے کہ یا تو سرے سے شخصیت نہیں رکھتے یا ناقص، ناتمام اور خام شخصیت کے مالک ہیں۔ پہلا گروہ ابلتا دان، سنی یا دیوانوں کا ہے۔ ذہنی قوتوں کی ناتمامی کی وجہ سے ان میں یہ اہلیت نہیں ہوتی کہ وہ سماج کی ہیئت ترکیبی اور اس کی حمایت کرا چھی طرح سمجھ سکیں۔ سماج کے لئے یہ وبال جان ہوتے ہیں۔ دوسرا گروہ مجرموں اور ناسزا کا ندوں کا ہے۔ یہ اعلیٰ مقام اور بہت ترین ذاتی اغراض میں فرق نہیں کر سکتے اور اپنے ذاتی مفاد کو جماعتی مفاد پر۔ پورے سماج کی صلاح و فلاح کو انفرادی خواہش کی آسودگی پر قربان کر دینے کے لئے قتل جانتے ہیں۔ چور، اچکے، ڈکیت، لٹیٹے، زنا کار، مکار، چلے، سود خوار، سرمایہ پرست، چور بازار میں بچنے والے سب اس گروہ میں شامل ہیں۔ تیسری قسم ان افراد کی ہے جن کی زندگی کا کوئی مقصد نہیں جو کسی معیار یا اصول کو نہیں مانتے۔ کسی اخلاقی پابندی کے قائل نہیں۔ شہوق کے پیچاری اور حال کو مال پر ترجیح دینے والے ہیں۔

ناپختہ اور خام شخصیت رکھنے والوں میں احساس مناسب کی کمی ہوتی ہے۔ وہ دور تک نہیں دیکھتے۔ نمایشی اور شوخ رنگ قدیں انکی

نظروں کو خیرہ کر دیتی ہیں۔ لذت اور ہست حیوانی یا جہلی خواہشوں کی تسکین ان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہوتی ہے۔

جو لوگ شخصیت کے مالک ہیں وہ سب ایک درجے کے نہیں۔ ان میں سے کچھ بڑی شخصیت کے ہیں اور کچھ چھوٹی شخصیت کے۔ پھر ان کے درمیان بے شمار مدارج ہیں۔ انسان کی عظمت اس کی شخصیت سے ہے۔ بڑی شخصیت کا انسان بڑا ہے۔ بڑی شخصیت والے انسان کی آرزو مولانا رومی کو تھی۔ حکیم دیوجانش کبھی اس کی تلاش میں دن دھاڑے ہاتھ میں شمع لئے بازاروں میں گھومتا تھا اور ہر شخص کا منہ قریب سے دیکھ کر کہتا تھا: ”اؤغھ! یہ انسان ہے۔ یہ تو بونا ہے۔ مجھے انسان چاہئے“ مرزا غالب شاید یہ جانتے تھے کہ آدمی کو انسان بننے کے لئے کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں۔ اس لئے انھوں نے نڈر ہو کر کہا تھا:۔

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا آدمی کو بھی میسر نہیں انسان ہونا

کوئی اور بڑی شخصیت کا مالک ہو یا نہ ہو ادیب کو ضرور بڑی شخصیت کا حامل ہونا چاہئے۔ گھٹیا شخصیت کا ادیب بڑھیا ادیب کی تخلیق نہیں کر سکتا۔ ادب اب ذاتی نہیں رہا۔ وہ سماج کے ایک ذمہ دار فرد کا عمل ہے جس کے اچھے یا بُرے ہونے کا اثر سماج کی صلاح و فلاح پر پڑتا ہے۔ سماجی نقطہ نگاہ سے ادب کو صالح، توانا، پر وقار اور مفید ہونا چاہئے۔ ادب اپنے خالق کی شخصیت کا پر تو ہوتا ہے اسلئے صالح، توانا۔ پر وقار ادب وہی ادیب پیدا کر سکتا ہے جو خود صالح، توانا اور با وقار ہو۔ شہد کی مکھی شہد پیدا کرتی ہے۔ بھڑ صرف ڈنگ رانا جانتی ہے۔ جس کے ڈنگ میں زہر ہوتا ہے۔

شخصیت کے گونا گوں پہلو ہیں جن کا ذکر اس فرصت میں نہیں کیا جاسکتا۔ ان رنگارنگ پہلوؤں کی تعمیر جن اسباب و محرکات کے زیر اثر ہوتی ان کی تفصیل کا بھی موقع نہیں۔ میں ادیب کی شخصیت کے ایک بہت ہی اہم پہلو کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ اس پہلو کے روشنی میں آجانے سے ایک بڑی غلط فہمی کے دور ہو جانے کا امکان ہے اور ہو سکتا ہے کہ ہم اس وضاحت کے بعد شاعر کے کلام کی خصوصیات کیسے پیدا ہوئیں اور اس کے کلام کا مزاج کیسے بنا۔

شخصیتیں دو قسم کی ہیں۔ ایک فعلی (ACTIVE) دوسرے انفعالی (PASSIVE) ابوالوقت اور ابن الوقت تصوف کی قدیم اصلا حیں ہیں جو بترتیب ان دو قسم کی شخصیتوں کے باہمی فرق کو واضح کرتی ہیں۔ شخصیت کے تعمیر میں سماجی حالات اور گرد و پیش کا بے شبہ بہت بڑا حصہ ہے۔ شخصیت با بعد الطبیعیاتی حقیقت ہوتے ہوئے بھی سماج کی ساخت پر داختر ہے۔ اس لئے ماہر نفسیات اسے طبیعی نفسی اجتماعاتی عصبیہ بتاتے ہیں۔ لیکن دو مختلف قسم کی شخصیتوں پر سماجی حالات کے دو مختلف اثرات ہوتے ہیں۔ انفعالی شخصیت سماج یا ماحول کے ہاتھ میں موم کی طرح ہوتی ہے۔ سماج جس شکل میں چاہے اسے ڈھالے۔ جو چاہے اس سے کام لے۔ اس میں قوت مزاحمت اور صلابت بالکل نہیں ہوتی اس لئے آسانی کے ساتھ بن کر بگڑتی اور بگڑ کر بن جاتی ہے۔ اس کے غلات فعلی شخصیت صرف ایک حد تک ماحول سے اثر قبول کرتی ہے۔ اس کے بعد اسے متاثر کرنا شروع کر دیتی ہے۔ ماحول سے تصادم۔ اس کی خامیوں کو محسوس کر کے اس کی اصلاح فعلی شخصیت کا کام ہو زندگی میں انقلاب اس شخصیت کے اثر سے آتے ہیں۔ اگر فعلی شخصیتیں نہ ہوتیں تو زندگی بغیر آشنائے ہوتی اور وہ روز ادل سے ایک حالت پر قائم رہتی۔ اقبال نے ذیل کے شعر میں فعلی شخصیت کے اسی پہلو کی طرف توجہ دلائی ہے:۔

حریث بے خبراں ہے تو بازمانہ بساز، زمانہ باتونہ ساز و تو بازمانہ ستیز

اگر نے فعلی شخصیت کے مالک کو اس کے مردانہ پہلو کو پیش نظر رکھا تھا اور یہ بتایا تھا کہ اس پر زمانہ یعنی ماحول کا اثر نہیں ہوتا۔ وہ زمانہ کو اپنی شخصیت کے زور سے بدل دیتا ہے:۔

لوگ کہتے ہیں بدلتا ہے زمانہ سب کو مرد وہ ہیں جو زمانہ کو بدل دیتے ہیں

ادہ پرست فلسفیوں نے کہا تھا کہ انسان ماحول کا غلام ہے۔ اسے گرد و پیش کے حالات اور معاشی تقاضوں نے پیدا کیا ہے۔ ایک عام انسان کی بابت صحیح ہو سکتا ہے جو معمولی شخصیت کا مالک ہے۔ ابوالوقت ماحول کو اپنی خواہش اور صوابدید کے مطابق ڈھالتا

ہے۔ اسے توڑ پھوڑ کر اپنی دنیا آپ پیدا کرتا ہے۔ موتی نے صدف کے بطن میں پرورش پائی اس لئے صدف کو موتی کا خالق کہہ سکتے ہیں۔ لیکن ریشم کے کیڑے کی بابت کیا کہیں گے جو اپنے منہ کے لعاب سے ریشم کے تار نکالتا ہے۔ اس ننھی سی مکڑی کو کیا کہیں گے جو تاروں کے جال بن کر اس میں رہتی ہے۔ اور جب ایک دیوار سے دوسری دیوار تک اسے جانا پڑتا ہے تو تار پھینک کر ایک پل تیار کر لیتی ہے اور اس پر سے گزر جاتی ہے۔

ڈرلٹن مری ان نقادوں میں سے ہے جنہوں نے اسلوب میں شخصیت کی جھلک دیکھی۔ وہ غالب کی ”چشم بیزا“ رکھتا تھا لیکن منصور کی طرح ”شک ظرف“ بھی تھا اس لئے پکارا اٹھا کہ اسلوب شخصیت ہے۔ شخصیت کے جن دو پہلوؤں کا ذکر اوپر ہوا ڈرلٹن مری نے شخصیت کے دو پہلو یعنی اسلوب میں وہ دونوں پہلو دیکھے۔ اس نے ایک کو کزخت (MASCULINE) اور دوسرے کو نازک (FEMININE) کہا اور یہ بتایا کہ کزخت اسلوب کسی دوسرے اسلوب کی نقل نہیں ہوتا۔ اس میں جدت اور اچھ پائی جاتی ہے۔

جدید مادی فلسفے پر مارکس اور اس کے رفیق اینگلسز کی بہت گہری چھاپ ہے۔ مارکس نے اٹھارھویں صدی عیسوی کی مادیت پر معاصر افسانہ نگار تھے۔ اول یہ کہ ”وہ میکانیکی اور غیر تاریخی ہے۔“ دوسرے یہ کہ اس میں انسان کو ماحول کی پیداوار بتا کر اس حقیقت پر پردہ ڈال دیا گیا ہے کہ انسان میں یہ طاقت بھی ہے کہ وہ اپنے ماحول کو بدل کر اپنی خواہش کے مطابق ڈھالے۔ ماحول کو بدلنے اور گرد و پیش کے سماجی حالات کو توڑ پھوڑ کر اپنے موافق بنانے والے انسان مرد ہوتے ہیں۔ عظیم شخصیت کے مالک ہیں۔ دنیا میں انقلاب آتا نہیں لایا جاتا ہے اور اس کے لانے والے ہی عظیم شخصیت کے لوگ ہوتے ہیں۔ ولیم جیمس نے لکھا ہے کہ بڑی شخصیتیں ماحول کو بناتی اور انقلاب کے لئے راہ ہموار کرتی ہیں۔ خود کبھی اس کے بنائے ہوئے راستے پر نہیں چلتیں۔ ماحول کو نئے قالب میں ڈھانا تخلیق ہے اور تخلیق زندگی ہے۔

زندہ خلاق شو، مشتاق شو
ہر کہ اور قوت تخلیق نیست
ہمچو مانگیرندہ آفاق شو
نزد ماجز کا فرد ز ندر بق نیست

سماج کی بابت دو نظریے ہیں۔ ایک حیاتیاتی دوسرے تاریخی۔ پہلے نظریے کے مطابق سماج کو موجودہ صورت فطرت اور انسان کے مزاج نے دی۔ دوسرے نظریے کے مطابق انسان کی مادی اور معاشی ضرورتوں نے اس کی ہیئت اجتماعی کو آگے بڑھایا۔ دونوں صورتوں میں انسان پابند اور مجبور رہا۔ پہلی صورت میں فطرت کا، دوسری صورت میں جبلت کا۔ پہلی صورت میں فطری خواہش نے انسان کو بدلنے پر مجبور کیا اور جیسے جیسے انسان کا فطری ماحول بدلتا رہا انسان کے معاشرے میں تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ دوسری صورت میں انسان کی مادی ضرورتوں نے اسے پہلے ایک خاص طرز کی اجتماعی زندگی بسر کرنا سکھایا اس کے بعد یہ ضرورتیں اس کے بنانے بگاڑنے پر تل گئیں اور اس کے ساتھ کھیل کھیلتی رہیں ایک حد تک یہ صحیح ہے۔ انسان فطری خواہش کا پابند بھی ہے اور اس کے جبلی تقاضے بھی ہیں جن کے سامنے اسے چار و ناچار جھکنا پڑتا ہے لیکن انسان صرف جسم و جبلت کا نام نہیں۔ اس کے کچھ اور تقاضے بھی ہیں جب ان تقاضوں کی اہمیت بڑھی، انسان نے تہذیب، شرافت، شائستگی کی طرف قدم بڑھایا۔ اجتماعی تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ انسان فطرت اور جبلت سے برابر نیرو آزما رہا ہے۔ اور جہاں فطرت نے اسے شکست دی ہے وہاں جبلت پر فکر کے پہرے بٹھا کر اور ذہنی قوتوں سے کام لے کر اس نے فطرت پر غلبہ بھی پایا ہے۔ انسان کی بے چارگی ہی اس کی توانائی ہے۔ فطرت سے ٹکر کر اس نے اپنے دبے ہوئے اور جبلت سے مغلوب انسانی جوہر کو چمکایا ہے۔ وہ اپنی باطنی صلاحیتوں کو اس طرح پر بروئے کار لایا ہے جس طرح پتھر پر رگڑ کھانے کے بعد شرارے نکلتے ہیں۔ یہ تو ممکن نہیں انسان باطنی خواہشوں کا کچلا گھونٹ رہا۔ انہیں دبا کر ختم کر دے اور انسان سے خشتہ بن جائے۔ لیکن وہ فطرت کو مجبور کر سکتا ہے کہ وہ اس کی ضرورتیں پوری کرنے میں نکل سے کام نہ لے۔ چنانچہ سماج کی مدد سے انسان فطرت کو مسخر کرنے میں لگا ہوا ہے۔ اگرچہ ابھی اس میں پوری کامیابی نہیں ہوئی، لیکن اگر کبھی کامیابی ہوئی تو وہ بڑی شخصیتوں کی کوشش کا نتیجہ ہوگی۔

اس کے علاوہ بڑی شخصیتوں نے سماج کے خلاف بغاوت بھی کی۔ اس کے بنائے ہوئے قاعدوں اور اصولوں کو توڑا۔ اس کے مسلمات اور تصورات کی دھجیاں بکھیریں کبھی انہیں اس میں کامیابی ہوئی اور کبھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ لیکن سماج سے انہوں نے کبھی سمجھوتا نہیں کیا

بڑی شخصیت کی فطرت میں بغاوت کی چنگاریاں ہوتی ہیں۔ انکار میں جدت، خیالات میں تازگی، افعال میں ندرت اور ارادے میں کوہ کی سسی استواری ہوتی ہے۔ کوہ پر شکاریں نے آسمان اور اس کی حرکت پر کاری ضرب لگائی۔ گلیلیو نے ارسطو کے قانون ثقل کو توڑا۔ کائنات نے اقلیت کی بنیادوں کو ہلایا۔ ڈارون نے ارتقاء کا سیدھا راستہ دکھایا۔ مارکس نے تاریخ کا معاشی نظریہ پیش کیا جو ایک بڑے سماجی انقلاب کا پیش خیمہ بنا۔ یہ سب سماج اور ماحول کے باغی تھے۔ ان کی فطرت نے انھیں بغاوت کی راہ سمجھائی تھی۔ ان کے نظریات و افکار نے ان کے سماج میں جو اجتماعی، سیاسی، اخلاقی اور ذہنی تبدیلیاں کیں ان کے اثرات ہمارے سامنے ہیں۔

(۳۷)

زبان سب سے بڑا سماجی مظہر ہے جس کی تعمیر میں پورے سماج کا حصہ ہے۔ لیکن بڑی ادبی شخصیتوں نے یہاں بھی بغاوت کی اور اپنی زبان خود بنائی۔ اس سے ان کی باغیانہ فطرت بے نقاب ہوتی ہے۔ اردو شعرا میں غالب نے اپنی زبان خود وضع کی اور اس زبان کی جامد اور ٹھیری ہوئی زبان کو نظر انداز کر کے ایک ایسی متحرک اور صدف رنگ زبان کو اپنایا جو اس کے گہرے، پر جوش جذبات اور حقیقت کا جگر چیرنے والے خیالات سے پوری طرح ہم آہنگ تھی۔ ذوق، غالب کے ہم عصر ہیں۔ موقوف نے جو زبان لکھی وہ مکہ رائج الوقت کی طرح تھی۔ اس پر سماج کی چھاپ لگی ہوئی تھی۔ ذوق کے یہاں اس لئے محاورات بہ کثرت استعمال ہوئے ہیں۔ غالب کے یہاں محاورات کی کمی اور زبان کے مروجہ اسالیب سے انحراف اس کی باغیانہ فطرت کا عکاس ہے اور اس سے اس کی مردانہ شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ اس لحاظ سے غالب اور تاج محل میں خاص مناسبت ہے۔ غالب نے جو کام دہلی میں رہ کر انجام دیا تاسخ لکھنؤ میں اس کے علمبردار تھے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ تاسخ نے اپنی پوری توجہ زبان و بیان پر صرف کی اور غالب فن کے ساتھ فکر پر بھی زور دیتے رہے۔ تاسخ کا کلام شاید اسی لئے بے جان سا ہے۔ اس میں فنی رکھ رکھاؤ کے باوجود شعریت اور جذبہ کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں غالب کے یہاں زبان کی جدت اور طرز بیان کی بدعت کے ساتھ فکر اور جذبے کی توانائی، گرمی اور چھاؤ بھی ہے۔

جہاں تک شخصیت کا تعلق ہے تاسخ بھی غالب کی طرح مردانہ جوہر رکھتے تھے۔ دونوں نے ماحول سے اثر لینے کی بجائے اس کو متاثر کیا۔ غالب، تیسرے عقیدت رکھتے تھے اور بقول تاسخ ان کا عقیدہ تھا:-

آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

لیکن اپنی توانا اور زلی شخصیت کی وجہ سے وہ تیسرے رنگ میں نہ رنگے جاسکے۔ بعض لوگوں کو غالب کے سادہ اور سہل ممتنع انداز پسند آئے۔ انھوں نے بعد میں اختیار کیا تیسرے تقلید کا دھوکا دیا اور وہ تیسرے سادگی اور غالب کی سادگی کے تازک فرق کو نظر انداز کر گئے۔ غالب کی سادگی میں بھی ایک طرح کی پرکاری ہے۔ بناؤ، ادا، اور افوت ہے۔ یہ تیسرے تقلید نہیں، غالب کے فن کا ارتقا ہے۔ غالب کے یہاں فکر اور جذبے کا بڑا اچھا امتزاج ملتا ہے۔ جہاں فکر کا غلبہ ہے اسلوب میں گیرائی اور خشک آگیا ہے اور جہاں جذبہ کا غلبہ ہے اسلوب میں گھلاوٹ روائی اور گیرائی پیدا ہو گئی ہے۔

غالب کی سادگی سے بعض نقادوں نے دھوکا کھایا اور وہ اس کے لیے اور تیسرے کو نظر انداز کر گئے۔ لیکن تاسخ کے یہاں کوئی دھوکا دینے والی چیز نہیں۔ ان پر تیسرے گیر اور بڑی شخصیت کا پرچھا فوا نہیں پڑا۔ تیسرے شاعری جذبہ ہے۔ غالب کی شاعری فن (ART) ہے۔ اور تاسخ کی شاعری صنعت کاری (Artifice) ان تینوں کی شاعری میں ان کی شخصیتوں کی جھلک ہے۔ تیسرے حساس جذباتی اور زور و رنج تھے۔ اور ساتھ ہی خاکسار اور فلسفہ بھی۔ ان کی جذباتیت اور خاکساری سے مل کر ان کی شاعری کا خمیر اٹھا۔ غالب حساس، خود دار، اتالی اور کسی قدر انفرادیت پسند تھے۔ ان کی خود داری اور انفرادیت کی جھلک ان کے کلام میں ملتی ہے۔ میں غالب کو تیسرے کی طرح زور و رنج اور غم سے مغلوب ہو جانے والا نہیں سمجھتا۔ وہ ذکی الحس ضرور تھے۔ لیکن انھوں نے دیکھ سیکو کو عیار کر کے اپنے لئے مشکلوں کو آسان بنالیا تھا۔ نو گھم اور نغمہ شادی یکساں طور سے ان کے لئے ہنگام گرم کن تھے۔ تیسرے یہاں بے ہمدانی نہیں۔ تاسخ نے تمام عمر ریاض

کیا۔ کسرت کر کے اپنے جسم کو بنایا۔ یہی کیفیت ان کے کلام کی ہے۔ وہ ان کی دماغی ورزش کا پروردہ ہے اگر ہمیں یہ معلوم نہ ہوتا کہ آتش نے ناسخ کی سحرانہ شخصیت کے زیر اثر شاعری کو نگوں کا جڑنا قرار دیا تو ہم ناسخ کو آتش سے بڑا شاعر سمجھتے۔ اس لئے کہ ناسخ کی شاعری مرصع سازی ہے اور آتش کو مرصع سازی سے دور کا تعلق بھی نہیں۔ آتش کی شخصیت کو میں نے اس لئے کمزور کہا کہ وہ برابر ناسخ سے قریب ہونے کی کوشش کرتے رہے۔ جرأت و انشاء کے نقش قدم پر بھی انھوں نے چلنا چاہا۔ لیکن ان کے صوفیانہ رجحان بلع اور مزاج نے چٹمک زنی کر کے انھیں روک لیا اور وہ اپنے استاد مصحفی کا رنگ دھو کر صاف نہ کر سکے

آتش تو رہے ایک طرف خود مصحفی جیسا ثقہ اور پختہ کار استاد آخری میں اپنی قدیم روش چھوڑنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ جرأت اور انشاء سے ان کے معرکے رہے اور انھیں اپنے اوجھے واروں اور کمزور ہتھیاروں کا احساس نہ ہوا۔ لیکن ناسخ کی نئی شریعت نے ان کو اتنا رجھایا کہ وہ اس راہ پر چلنے کی فکر کرنے لگے۔ چنانچہ اپنے آخری دیوان کے دیباچہ میں انھوں نے ناسخ کی شریعت کو سراہا ہے اور لکھا ہے کہ میں نے اس دیوان میں ناسخ کا رنگ اڑانے کی کوشش کی ہے۔

غالب اور ناسخ کے بعد اردو شعراء میں سے حالی تو انشا شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا کام تیسرا غالب اور ناسخ کے مقابلہ میں مشکل بھی تھا اور انقلابی بھی۔ حالی نے اردو شاعری کے مزاج کو بدلا اور اس میں سادگی، خلوص، دل گدازی پیدا کی جس سے وہ تکلف، مبالغہ اور صنعت گری کے شوق میں عرصہ ہوا محروم ہو چکی تھی۔ خلوص اور سادگی حالی کی شخصیت کے جدہ ہیں۔ تیسرا اور سودا کے بعد قریب قریب تمام شعراء نے ان کی تقلید کرنی چاہی۔ وہ ان کا انداز اپنے کلام میں پیدا کرنے کی کوشش میں رہے اس لئے اردو شاعری میں انداز بیان کو مضمون پر برتری حاصل ہو گئی۔ حالانکہ حقیقت اس کے خلاف تھی۔ ہر مضمون کا انداز جدا ہوتا ہے اور ہر خیال اظہار و بیان کا پیرا۔ اپنے ساتھ بیکھر آتا ہے۔ اردو کے جن شعراء نے تجنیل کو آزاد رکھا اور کسی بڑے شاعر کا رنگ اڑانے کی بجائے خیال جس قالب میں ڈھل کر آیا وہی طرح ادا کر گئے وہ کامیاب رہے اور ان کے کلام کو مقبول عام اور بقائے دوام حاصل ہوا۔ اور جو تقلید کے شوق میں تیسرا و مرزا کا رنگ پیدا کرنے کی فکر میں رہے وہ اپنے لئے کوئی بڑی جگہ پیدا نہ کر سکے۔ حالی نے اس کو محسوس کیا۔ انھوں نے خیال کو طرزا اور ترجیح دی اور اس میں وہ اتنے آگے بڑھے کہ اسلوب کو نظر انداز کر کے انھوں نے اپنی نئی شاعری کی بنیاد صرف خیال پر رکھی۔ چنانچہ مسدس کے روکھے پھیکے انداز کو دیکھ کر بد مزاق لوگوں کو ابالی کچھڑی کی بھتی سوجھی۔ مسدس میں سچے جذبات سادہ اور فطری انداز میں بیان ہوئے تھے اس لئے ابالی کچھڑی مرغ پلاؤ سے زیادہ پسند کی گئی۔ حالی کا کام مشکل تھا اس لئے کہ اردو شاعری کی ڈیڑھ سو سال پرانی روایت کے اثر سے عام طور پر مذاق سخن بگڑ گیا تھا۔ حالی اس بگڑے ہوئے مذاق کو سدھارنا چاہتے تھے۔ حالی نے بڑی حد تک اردو شعرا کا مذاق بدلا تکلفات اور چٹخاروں سے انھیں نجات دلائی۔ حالی کے بعد چکبست، اکبر اور اقبال آئے۔ انھوں نے خیال کو اسلوب پر مقدم رکھا لیکن ساتھ ہی اسلوب کا دامن بھی ہاتھ سے نہ دیا۔ ان کے یہاں فن اور فکر میں فن کا رانہ ہم آہنگی ہے۔

(۴۴)

شخصیت ادب میں بڑی چیز ہے۔ لیکن کیا شخصیت اپنی ساخت میں ماحول سے بے نیاز اور گرد و پیش کے سماجی حالات سے غیر متاثر رہتی ہے۔ اگر شخصیت کی تعمیر میں ماحول کو دخل ہے اور بڑی شخصیت کی تخلیق بھی سماجی اور معاشی حالات کے زیر اثر ہوتی ہے جیسا کہ اے۔ اوڈن (ADDEN) نے لکھا ہے تو ہر پھر پھر سماجی ماحول کا سوال سامنے آتا ہے اور کہنا پڑتا ہے کہ ادب ماحول کا آئینہ ہے اس میں ماحول کی جھلک نظر آتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ شخصیت، ماحول اور سماجی حالات سے بے نیاز نہیں ہوتی۔ لیکن میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ شخصیتیں پیدائشی طور پر مختلف ہیں جن میں آبائی خصوصیات کے علاوہ اور بھی کئی قسم کے اثرات کام کرتے ہیں۔ ماحول کا اثر ان مختلف شخصیتوں سے مختلف طرح ہوتا ہے۔ عام اور معمولی شخصیت ماحول سے ریجالی اثر لیتی ہے۔ ماحول جیسے اسے ڈھالتا ہے ٹھیک اسی طرح ڈھل جاتی ہے۔ روش عام سے انحراف

اور چاروں طرف ایک جال کی طرح پھیلے ہوئے میلانات کے خلاف بغاوت کا جذبہ اس میں پرورش نہیں پاتا۔ اس کے برعکس غیر معمولی شخصیت پر ماحول کا بیشتر سلبی اثر ہوتا ہے وہ ماحول کے میلانات کو قبول کرنے کی بجائے رد کرتی ہے۔ ان کے سامنے سر جھکانے کی جگہ ان سے سرباوی کرتی ہے۔ معمولی شخصیت ”ہے“ پر اپنی نظریں مرکوز رکھتی ہے اور غیر معمولی شخصیت ”چاہئے“ پر۔ حقیقت کے متعلق ان کا نقطہ نگاہ مختلف ہوتا ہے۔ معمولی شخصیت حال کو حقیقت سمجھتی ہے اور اس پر جمی رہتی ہے۔ غیر معمولی شخصیت آئال یا استقبال کو حقیقت سمجھ کر حال کو بدلتے اور اپنے آدرش کے مطابق ڈھالنے پر تل جاتی ہے۔ اس کی کامیابی یا ناکامی کا دار مدار شخصیت کے ایک دوسرے پہلو پر ہے۔ جن میں عدم، ارادے، استقلال اور پامردی کے جوہر ہوتے ہیں وہ مخالفت ماحول کو اپنے مقصد کے مطابق بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ورنہ ناکام رہتے ہیں۔ ارسطو نے غلامی کی حمایت اگر اس لئے کی کہ اس زمانہ کی یونانی تہذیب کا وہ ایک جزو ہو گئی تھی تو شارع اسلام نے اس کے خلاف آواز کیسے اٹھائی۔ کیا عرب میں غلامی کا رواج نہ تھا۔ کیا ان کی زندگی میں غلامی کی خبریں مضبوط نہیں ہو گئی تھیں۔ گوتم بردھ کے زمانہ میں جانور قربان کرنے کا رواج عام تھا۔ پھر گوتم نے قربانی کے خلاف جہاد کیسے کیا۔ مثالاً کی کو یہ احساس کیونکر ہوا کہ زمین پر کام کرنے والے مظلوم ہیں اور اس نے اپنی زرعی زمین ان کمیروں میں کیسے تقسیم کی۔ حالی نے اپنے بگڑے ہوئے مذاق سخن کے خلاف اثر کیسے لیا اور شعر کی صداقت اور دلگدازی کو شاعرانہ مبالغہ آرائی اور دل فریبی سے زیادہ عزیز نہ کر سمجھا۔

لینن نے کہا تھا کہ کوئی فرد کسی ماحول میں پیدا ہو جانے سے اس طبقے کا نہیں ہو جاتا جب تک اس کا شعور اور اور عمل اس کے مطابق نہ ہو۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک فرد کا شعور اور عمل ماحول کے خلاف ہو سکتا ہے۔ ماحول کو بنانے بگاڑنے میں اتنا دخل نہیں جتنا بتایا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سماج میں کسی فرد واحد کی رائے کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ سماجی ارتقاء پر صرف وہی نظرئے اثر انداز ہوتے ہیں، جن پر سماجی ترک و اختیار کی چھاپ ہے، جنہیں سماج کی اکثریت نے اختیار کر لیا ہے یا مسترد کر دیا ہے۔ لیکن فعلی شخصیتیں سماج کے مزاج میں بہت کچھ دخل رکھتی ہیں۔ ان میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ سماج کو اپنے ساتھ لے کر چلیں۔ وہ جو فیصلے کرتی ہیں سماج کی اکثریت ان کے سامنے جھکا جاتی ہے۔ اس کے بعد ان کے فیصلے انفرادی نہیں رہتے۔ پورے سماج کے فیصلے ہو جاتے ہیں۔ سماج میں تبدیلیاں ہمیشہ اسی طرح ہوتی ہیں۔ اس کے ارتقاء کی سرشت ہی ایک راہ ہے۔ پروفیسر سیلگمین (SELEG MAN) تاریخی مادیت کے مبلغوں میں سے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ بڑے رہنماؤں کے اٹل فیصلوں اور بلند پرواز خیالات نے دنیا کو آگے بڑھا یا ہے۔ اگر یہ لوگ نہ ہوتے تو دنیا ترقی کی طرف قدم نہ اٹھاتی۔ سیاست کے میدان میں سب اسے مانتے ہیں کہ عوام بھیڑ بکریوں کی طرح ہنکائے جاتے ہیں۔ نفس اجتماعی بڑی شخصیتوں کا راجہ پر داختم ہے۔ جو اجتماعی نفسیات میں درک رکھتے ہیں وہ پورے سماج کے رہنما بن جاتے ہیں۔ پورا سماج ان کی آنکھوں سے دیکھتا اور ان کے ذہن سے سوچتا ہے۔ لیکن ادب میں اس حقیقت کو نظر انداز کیا جا رہا ہے اس کے ذمہ دار زیادہ تر وہ ادیب ہیں جو ادبی بصیرت نہیں رکھتے۔ ادب میں ان کی کوئی جگہ نہیں۔ اپنے لئے جگہ پیدا کرنے کی غرض سے وہ سماج اور ماحول کا نعرہ لگاتے ہیں۔ اقبال نے سماج کے ارتقاء کو اچھی طرح سمجھنے کے بعد جمہوریت کا انکار کیا تھا اور ایک اجتماعی نظریہ کی حیثیت سے اسے گمراہ کن قرار دیا تھا۔ جمہوریت کو نظریہ کے طور پر مان لینے کے معنی ہیں سماج کی اکثریت کے سامنے سر جھکا دینا، جو کچھ ہوتا آیا ہے اس پر اڑے رہنا، اور کسی چیز کی اچھائی یا بُرائی کا معیار یہ ٹھہرانا کہ سماج نے اس کو اچھا یا بُرا سمجھا ہے۔ یہ غلط ہے۔

گرینڈ از طرز جمہوری، غلام بختہ کارے شو
کہ از مغز دو صد فکر اٹھانے نہ می آید

(ڈاکٹر) شوکت سہروردی

شیفۃ کی اردو شاعری

بہت دنوں کی بات ہے اپنی ایک تصنیف کے سلسلہ میں کسی شامت زدہ نے علامہ نیاز فتحپوری سے شیفۃ کی شاعری کے بارہ میں انکی رائے دریافت کی تھی اور ساتھ ہی ساتھ اپنی رائے بھی لکھ بھیجی تھی جو قطعاً اچھی نہ تھی۔ نیاز صاحب بہت گرجے بہت برسے۔ اس غریب کو آڑے ہاتھوں لیا، اس کے ذوق کا ماتم کیا، اس کی رائے کا مذاق اڑایا اور اس کے خیالات کو اس کی کم علمی پر محمول کیا اور لکھا کہ اس کی رائے غلطی پر مبنی ہے اور اس سے پہلک کے گمراہ ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ حیرت ہے کہ کسی اچھے شاعر کے متعلق کسی غیر معروف و کم علم اور بد ذوق و غیر منصف شخص کی رائے پہلک کو کیسے گمراہ کر سکتی ہے؟ اگر شیفۃ کا سرمایہ کلام واقعی اچھا اور بہت اچھا ہے تو اس کے متعلق کسی خراب رائے کا اظہار کہاں تک کلام کی وقعت کو کم کر سکتا ہے؟ اپنی طرف سے نیاز صاحب نے شیفۃ کے کلام کے متعلق جس رائے کا اظہار کیا تھا اس کا خلاصہ انھیں کے الفاظ میں یہ ہے کہ:

”شیفۃ اپنے زمانہ کا نہایت اچھا شاعر تھا اور یہ ممکن نہیں کہ مومن و غالب کے ذکر کے ساتھ اس کو نظر انداز کر دیا جائے۔“

نیاز صاحب کے ان الفاظ نے مجھے بڑی شدت سے اپنی محرومی کا احساس دلایا اس لئے کہ اُس وقت مجھے شیفۃ کے دس پانچ ہی اشعار یاد تھے۔ وہی اشعار مشہور تھے۔ انھیں کو تذکروں میں دیکھا آیا تھا اور ان سے اُن سے سنتا آیا تھا۔ اب جو نیاز صاحب نے اتنی ساری باتیں لکھ دیں تو دیوان شیفۃ کے مطالعہ کا اشتیاق تیز سے تیز تر ہو گیا لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ حیرت بھی فزوں ہوئی گئی کہ آخر نیاز صاحب نے بھی اپنے مقالے میں انھیں اشعار کے حوالہ پر کیوں اکتفا کی جو مشہور ہیں اور اگر اچھے اشعار ہیں اسی قدر ہیں تو پھر شاعر کے متعلق رائے دینے میں اتنی فیاضی اور ہند آہنگی سے کیوں کام لیا گیا؟

ابھی حال میں اکاڈمی پنجاب لاہور کا ترتیب دیا ہوا دیوان شیفۃ مجھے ملا جو صحت و نفاس کے ساتھ طبع ہوا ہے۔ میں نے بڑی بے سبوری سے دیوان اُٹھایا لیکن یہ ”بے سبوری“ دو چار صفحے کے بعد ہی بڑی ”صبر آزما“ نکلی اور مطالعے کے بعد تو میں سوچنے لگا کہ کیا نیاز صاحب کے پیش نظر واقعی شیفۃ کا پورا دیوان تھا؟ اس دیوان کے ساتھ جناب صلاح الدین احمد صاحب کا ایک طویل مقالہ بھی ہے جس میں انھوں نے سارے جہاں کی شاعرانہ خوبیاں کلام شیفۃ سے وابستہ کر کے گویا رسم فاتحہ ادا کی ہے لیکن ان کی تمام ”انتقادی مسجحات“ کے باوجود کلام شیفۃ کا یہ حال ہے کہ نہ منہ سے بولے نہ سر سے کہیں۔ مجھے اس پر اصرار ہے کہ صلاح الدین صاحب کا مقالہ اپنی جگہ خوب ہے، لیکن مجھے اس پر بھی اصرار ہے کہ یہ مقالہ شیفۃ کی شاعری سے قطعی الگ کوئی چیز ہے۔

دس پندرہ بلکہ بیس کہیں اشعار کی بنیاد پر یہ فتویٰ دے دینا کہ شیفۃ اپنے عہد کا نہایت اچھا شاعر تھا اور اس کا ذکر غالب و مومن کے ساتھ ہونا چاہئے انتقادی ہے۔ نیاز صاحب، صلاح الدین صاحب اور دوسرے حامیان شیفۃ اس پر زور دیتے ہیں کہ غالب نے شیفۃ کی سخن فہمی کی بڑی تعریف کی ہے۔ ان کی شاعرانہ صلاحیتوں اور ان کے ذوق سخن کو سراہا ہے لیکن اول تو سخن سنجی اور سخن فہمی ایک دوسرے کا معیار نہیں اس لئے یہ کہنا کہ غالب و مومن کی سندان کو اچھا شاعر بھی بناتی ہے غلط ہے اور دوسرے ہمیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ شیفۃ صرف شیفۃ نہ تھے بلکہ غالب مصطفیٰ خاں بھی تھے۔ خوش قسمتی سے ان کو زمانہ بھی وہ ملا جو اردو شاعری کا سنہرا زمانہ تھا اور اپنی ”نوائی“ کی بنا پر انھیں اس دور کی مشاہیر و مقتدر ادبی شخصیتوں کی رفاقت بھی میسر تھی۔ ان کو شعرو شاعری کا ذوق بھی تھا۔ اچھے اور برے اشعار کی پہچان بھی تھی، فن شاعری کا مطالعہ بھی تھا لیکن کیا یہ وسائل ایک اچھا شاعر بنانے کے لئے کافی ہیں۔ کیا تیسرے غالب کو انھیں وسائل نے اچھا شاعر بنایا؟

شیفۃ کا فن یکسر انکسائی ہے۔ ان کے یہاں سرتا سر آورد ہے۔ ان کا کلام ادل سے لیکر آخر تک ایک کاوش ہے اور کاوش بھی ایسی جو ہر جگہ نمایاں ہے۔ وہ فطرت کی طرف سے شاعر کا دل لے کر نہیں آئے تھے۔ آپ ان کو

COMPOSER

کہہ لیجئے یا زیادہ سے زیادہ

ادبی شاعر یعنی LITERARY POET

شیفۃ کے رنگ سخن کا جہاں تک تعلق ہے وہ لکھنؤی زیادہ اور بہت زیادہ ہے اور دہلوی کم اور بہت کم۔ ان کا وطن دہلی تھا۔ ان کی بود و باش وہیں تھی۔ ان کو رفاقت بھی انھیں شاعروں کی حاصل تھی جو طرز دہلی کے نمائندہ تھے۔ ان کے محبوب شعرا بھی شعرا آئے دہلی تھے لیکن خود ان کی شاعرانہ رنگ لکھنؤی انداز سخن کے لئے پھر کتنی رہتی تھی۔ شاید اس کا سبب ان کی ”نوابی“ اور ”ریاست“ ہو۔ لکھنؤ کا رنگ اپنی جگہ ایک رنگ ہے۔ شیفۃ کے معتقدین کو اس پر اصرار کیوں ہے کہ شیفۃ دبستان دلی کے کامیاب نمائندہ ہیں؟ خصوصاً جبکہ شیفۃ کا یہ رنگ بہت ہی نمایاں اور ابھرا ہوا ہے۔ بلند پایہ شاعروں کی رفاقت اور شعروں کی زندگی کی صلاحیت کے باوجود شیفۃ کا کلام اس تب و تاب سے محروم ہے جو بلند پایہ شاعروں کی رفاقت کے بغیر بھی جلوہ گر ہوتی ہے، شیفۃ کا کمال صرف یہ ہے کہ انھوں نے نوابی اور شاعری کے اجتماع کو محض لازماً ریاست نہیں سمجھا بلکہ واقعی شعروادب میں دلچسپی لی۔ شاعروں سے فیض اٹھایا۔ شاعروں کا تذکرہ لکھا اور خود بھی شاعری کی لیکن اسے کیا کہیے کہ ”فکار سخن“ اپنے سنگار کے لئے شاعر کے ”خون دماغ“ سے زیادہ ”خون دل“ کا خراج مانگتی ہے۔ بقول اقبال خون جگر کے بغیر پر نقش ناتمام اور ہر نغمہ سودائے خام ہے۔ شیفۃ کے یہاں اس مہر کی جگہ کی دو چار چھینٹیں بھی نہیں ہتھیں۔ وہ ”دل“ سے نہیں ”دماغ“ سے شعر کہتے تھے۔

شیفۃ کا ایک مشہور شعر ہے:

ہائے وہ شیفۃ کی ہتھالی، تمام لینا وہ سیری محل کو
مان لیا کہ اچھا اور بہت اچھا شعر ہے لیکن اسی غزل کے ان اشعار کو بھی دیکھیے:

بوسہ لب نہ مانگنا دشمن منہ لگاتا ہے کون سایل کو
گل کو ہے اس کے کان سے تشبیہ کیا سنے نانا عتاد دل کو
اب وہ نو خط ہے طفت و کھفا نقشِ تسخیر خطِ باطل کو
تجھ کو اسے رشکِ فوج و دوں تشہیم نہ ہو نقصان ماہِ کامل کو،

خدا را کوئی بتائے کہ یہ کہاں کی شاعری ہے۔ یہ کن احساسات و جذبات کی زبان ہے۔ وہی لکھنؤی انداز ہے۔ بے جان رسمی تشبیہیں، پرتکلف طرز بیان، فرسودہ مضامین، کہاں کا اثر اور کیسی تاثیر۔ دیوان شیفۃ کا بیشتر حصہ اپنے رنگ و آہنگ کے اعتبار سے خاص لکھنؤی ہے۔ چونکہ شیفۃ یکسر آورد کے شاعر تھے اور جرمِ کر شعر لکھتے تھے اس لئے ان کے یہاں تکلف و بیان اور وقتِ اظہار کا پایا جان ناگزیر تھا اس لئے ان کی بعض اچھی اور رواں دواں ”زمینیں“ بھی بخی نظر آتی ہیں۔ ان کا ایک مطلع ہے اور بہت خوب مطلع ہے کہ:

شکوہ جفا کا کیجئے تو کہتے ہیں کیا کروں تم سے وفا کروں کہ حد سے دفا کروں
اس رواں ہلکی پھلکی زمین کو شیفۃ نے کس طرح رہنما ہے اسے دیکھیے:-

تم دلیرا ہو دل کو اگر لے گئے تو کیا جب کاہ ہو کے میں اثر کبرا کروں
پیتا ہوں میں مدام سے ناب معرفت، اصلِ شرور و آمِ خوابت کو کیا کروں
میں جل گیا وہ غیر کے گھر جو چلے گئے شعلے سے استعارہ آواز پا کروں

یہ اشعار سرتا سر دماغی ورزش کا نتیجہ ہیں۔ ان میں ”کوہِ کنڈل دکاہ ہر آوردن“ کی بات ہے۔ آخری شعر خاص طور پر محض رعایتِ لفظی اور اس سے پیدا شدہ معنوی سہ راہ روی کا نمونہ ہے۔ تکلف بیان بھی ہمیشہ ذہنی ورزش کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ غالب کے اکثر اشعار میں

وقت بیان اور تکلف اظہار ہے لیکن اس پر آورد کا گمان تک نہیں ہوتا۔ یہ وقت بیان اور تکلف اظہار ان کی طبیعت کا جزو ہے۔ ان کی بے ساختہ بات میں بھی بیک نظر ایک قسم کے تکلف کا احساس ہوتا ہے مثلاً:

پھر بھر رہا ہوں خامہ مرگاں بخون دل ساز چمن طرازی داناں کئے ہوئے
دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے پندار کا صنم کردہ ویراں کئے ہوئے

ان میں آورد نہیں بلکہ ان میں غالب کے بہتیرے دیگر اشعار کی طرح ایک "بے ساختہ تکلف" اور ایک "پر تکلف بے ساختگی" ہے یہ غالب کا خاص وصف ہے۔ نواب صاحب کے یہاں یہ بات نہیں۔ ان کے یہاں وہی زور آزمائی ہے جو ناسخ کے یہاں ہے، لیکن نسبتاً معتدل اور کم اور اس کا سبب صرف یہ ہے کہ ان کے رفیق و جلس شعرائے دہلی تھے۔ اگر شیفۃ کو دہلی کا ماحول نہ ملتا تو وہ بالکل ناسخ ہوتے اس لئے ان کا شاعرانہ مزاج ہی لکھنوی ہے۔ جہاں انھوں نے لکھنوی انداز سخن سے بے گانگی برتی ہے وہاں ان کا کلام "ثقیل" نظر آتا ہے۔ مآلی نے اور صلاح الدین احمد صاحب نے شیفۃ کی سادگی بیان کا بڑا چرچا کیا ہے لیکن آپ کو دیوان شیفۃ میں ایسے اشعار کی ایک معقول تعداد ملحوظیگی جس میں شیفۃ نے غزل کی زبان استعمال نہ کرتے ہوئے غزل کہی ہے۔ بھاری بوجھل الفاظ کی ان کے یہاں کمی نہیں ہے۔

قیس کو جو کہے خفیف العقل
رہے اس شخص کی سدید نہیں
ہے رشک بار عام غضب کیا عجب مگر
کنج خمول میں ہو سس اغشاکت ہو
بد مستیاں کبھی، کبھی مستوری و عفاف
دستور ہے طبیعت نامستقیم کا
ہے شرط عشق یہ کہ نہ غفلت ہو ایک دم
کیسا ہی دل پھنسا ہوا مور عظام میں
تا فرق آئے بات میں فرائشیں وہ کیں
تعبیل جن کی ہونہ سکے انصرام میں
اب جیتو ہے ان کو ہماری تو کیا حصول
باقی نہیں اثر بھی عظام رمیم کا
وہ طرفہ حال کہ جس سے جاد قص کرے
نہ رنگ بھی متغیر ہو اہل تمکین کا،
ڈر ہے کہ ہونہ شوق مزا میر شیفۃ
در نہ کبھی سماع خبر دسنا کردوں
مکشوف ہوا فروغ سے سے
ذردہ میں کس آفتاب کا ہوں

غرض کہ ان کے یہاں ثقالت بیان کی مثالیں بھی کثرت سے مل جاتی ہیں۔ اب خالص لکھنوی انداز کے اشعار بھی دیکھتے چلیے:-

دیکھ کر چشم غضب کو اس کی میں نے رو دیا
چاہئے پانی ملا لینا شراب تیز کو
ہے خراش ناخن غم میں بھی کیا بالیدگی
جو ہلال غمہ سقا سواہ کامل ہو گیا
کیا بن گیا ہوں صورت دیوار دیکھنا
صورت کسی کی میں سر دیوار دیکھ کر
لکھتا ہوں زلیں آرزوئے قتل میں نامے
میں میرے کبوتر بھی ترے تیر کے مشتاق
تقریب میری گور کی لازم ہے خوب سی
تقریب ہوں زلیں آرزوئے قتل میں نامے
کھٹکوں عدد کی آنکھ میں تا بعد مرگ بھی
کیا شوق جستجو ہے کہ گر پاؤں ٹوٹ جائیں
تشبیہ تیری زلف سے دی ہونہ غیر نے
و شمن کہیں گیا ہونہ آنکھوں سے شیفۃ
افغان چرخ اس کی پٹ نے جلا دیا،
ہزار مرتبہ فریاد جان شیریں دے
یہی ہے حق تک عشوہ ہائے شیریں کا

ان تمام اشعار میں لفظی و معنوی رعایتوں کا ایسا نامضبوع اظہار ہے کہ ذوق لطیف منتفض ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ تخیل کی بے راہ روی کی مثالیں شیفۃ کے یہاں کثرت سے مل جاتی ہیں۔ اس کی بھی جھلک دیکھ لیجئے :-

اسے یاد صبح تاجہ کجا ہستراؤ گل ، گوشہ الٹ دے یار سے منہ کے پرند کا
شرک خسرو ہے تصرف ناز شیریں بے اثر ، سینہ فریاد مثل بے ستوں سیل ہو گیا
سرد ہوا دل وہ ہے فیروں سے گرم ، شعلے نے اٹا مجھے ٹھنڈا کیا
دیکھوں تو کہیاں تک وہ لطف نہیں کرتا ، آری سے اگر چہرے تو میں اُن نہیں کرتا
ذبح اس کو بھی مودن ہی مگر کرتا ہے ، کیوں شب وصل میں غل مرغ بھر کرتا ہے

غرض کہ شیفۃ کا یہ رنگ ان کے دیوان میں اس قدر نمایاں ہے کہ اس سے اغماض کرنا ممکن نہیں۔ ان تمام اشعار کا لب و لہجہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ شیفۃ کی طبیعت ناسخ کے مزاج سے متاثر ہے۔ ناسخ کے طرز میں جو چیز نمایاں ہے وہ ان کا تمثیلی انداز ہے وہ شیفۃ کے یہاں بھی ہے اور ایسی رعایتوں اور صنعتوں کی تو ان کے یہاں گنتی ہی نہیں جن سے بجائے حسن و اثر میں اضافہ ہونے کے بد مزگی بڑھتی ہے رعایتیں ہمیشہ بے لطف و بے معنی نہیں ہوا کرتیں۔ شیفۃ ہی کا ایک اچھا شعر ہے :-

اسے فلک یوں کامیاب عیش کر پرویز کو
نواب شیریں بھی نہ ہو فریاد شور انگیز کو

یہاں خواب شیریں شاعر کے ذوق و ذہانت کی دلپذیر مثال ہے اور اسی لئے ایک جذباتی رنگ آگیا ہے لیکن اس شعر کو دیکھئے :-

عید کے دن ذبح کرنا اور بھی اچھا ہوا ، حلقہ اسلام میں وہ شروع داخل ہو گیا

وہاں ”خواب شیریں“ کی بات تھی یہاں ”ذبح عید“ کی بات ہے۔ رعایتیں دونوں میں ہیں مگر فرق ظاہر ہے، شیفۃ کثرت سے لفظی رعایتوں کی طرف مائل نظر آتے ہیں۔ اوپر کے اشعار میں کئی مثالیں مل جائیں گی۔ دو ایک اشعار اور بھی دیکھئے :-

اس ماہ و ش کو غیر سیہ رو سے کام کیا ، ہے قبض اپٹ اختر بخت نثرند کا
یاد میں اس دردندوں کی مواجہتا ہوں ، کار الماس مرے حق میں گہر کرتا ہے
کچھ تو شیریں کام کر تخی کش ہے داد کو ، دے کفن تو عشق شیریں باؤں کا فریاد کو
صبر پر دانے کا مجھ پر نہ پڑے ڈرنا ہوں ، ماہر و شمع کو ہرگز نہ جلانا شب وصل
اور پھر ان سب کے ساتھ شیفۃ اس رنگ میں بھی تھے :-

بوسے کے قبول تو گنتی بھی چھوڑ دو ، ایسا نہ ہو کہیں پڑے جھگڑا حسا میں
خواہش کام دل اتنی نہ کرے شوق کہ وہ ، ڈھونڈتے ہیں چلے جانے کو بہانا شب وصل

مقصود اس ساری گفتگو کا یہ ہے کہ شیفۃ کے یہاں وہ تمام شاعرانہ قیمتیں موجود ہیں جو اُس دور کے دبستان لکھنؤ میں رائج تھیں۔ تخیل ہرگز شاعری کے لئے مضر نہیں لیکن تخیل کی بے راہ روی البتہ ناقابل برداشت بات ہے۔ فکر (THOUGHT) کا عنصر دبستان دہلی کے شعرا میں بھی کم نہیں لیکن وہ فکر لکھنؤی فکر لکھنؤی فکر سے یکسر مختلف ہے۔ شیفۃ ہی پر منحصر نہیں، غالب بھی جب لکھنؤ کی زد میں آئے اور اپنی ایک مرتع جذباتی عزل میں آ گئے کہ :-

داغ دل گر نظر نہیں آتا ، جو بھی اسے چارہ گر نہیں آتی

تو ہما شاکا کیا ذکر لیکن شیفۃ نے تو مزے لے لے کر ایسی رنگ میں داد سخن دی ہے اور طرح طرح سے شاعری کا سوانگ رچایا ہے۔ شیفۃ کا ایک شعر ہے کہ :-

شیفۃ کیسے ہی معنی ہوں مگر نامقبول اگر اسلوب عبارت میں متانت کم ہو
اسلوب عبارت کی متانت اگر صرف ابتذال اور پچھلے دنوں سے احتراز ہے تو شیفۃ کا کلام متانت اسلوب کا حامل ہے لیکن اگر متانت
میں سادگی اور نرمی، صفائی اور شگفتگی، عصومیت اور پاکیزگی، کو بھی شامل کیجئے تو شیفۃ کا لب و لہجہ گیسر متین بھی نہیں۔
شیفۃ کو ایک بڑا شاعر ماننے میں تامل کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ان کی اپنی کوئی انفرادیت نہیں، انھوں نے غالب کی زمینوں میں قصداً
طبع آزمائی کی، مومن کا طرز انھوں نے اپنایا، حالی کی صحبت سے بھی فیض اٹھایا، اور ناسخ تو خیر ان کے ذہنی رہنما ٹھہرے، اس لئے شیفۃ کا سارا
کلام ایک مرکب قسم کی چیز ہو گیا ہے وہ اپنی انفرادیت کی کوئی راہ نکال ہی نہیں سکتے تھے۔ غالب کا رنگ شیفۃ کے یہاں صرف تراکیب اضافت
تک ہے۔

کبھی تمکین صولت آفریں کیوں کبھی الطاف جبرأت آزما کیا
کبھی وہ طعنہ دے جانگزا کیوں کبھی یہ غمزہ دے جانگزا کیا
کھولے گرد دل کو ترا تاخیر شمشیر یہ کام اجل سے بھی روا چاہیں سکتا
شیفۃ کا رنگ وہاں اور بھی پوچھل ہے جہاں انھوں نے مشکل ردیفوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ ذ۔ ص۔ ض۔ ط۔ ظ۔ ع۔ ف۔ ق۔
ان تمام ردیفوں میں کاوش سخن کی گئی ہے۔

گل پر لگا کے آپ سے پہنچیں گے بے طلب آئے گی اپنے پاؤں سے یاں بن بلائے شمع
کسی ستم نے مگر آپ کو جلا یا ہے نہیں تو حوروں کی کیوں اس قدر ثنا دعا عطا
کیا کیجئے بدگمانی ابرو کا دھیان ہے کرتے دگر نہ بھر میں تیغ قضا سے ربط
حسن باطن زبونی ظاہر ہے مئے ناب اور جام اصداص
بد دماغ آج ہوا وہ گل رہ شیفۃ عطر لگانا موقوف

مشکل ردیفوں میں اسی طرح کے مضامین زیادہ پائے جاتے ہیں۔ شیفۃ کے یہاں جذبات کی دھوک محسوس نہیں ہوتی۔ ان کی شاعری
برق کی ٹلی ہے۔ بے جان۔ سرد۔ اچھے اشعار کی تعداد محدود رہی ہوگی۔ ان کے اردو دیوان میں جس میں دو ہزار سے زیادہ اشعار ہیں
مشکل سے پندرہ بیس اشعار ایسے ملیں گے جو آپ کی توجہ کو ایک گھڑی کے لئے روک سکیں گے۔ رعایتوں اور صنعتوں سے جو اشعار بچے ہیں
ان میں بھی اکثریت ایسے اشعار کی ہے جن میں نہ حسن بیان ہے نہ حسن معنی، ہر چند ثقافت یا تخیل کی بے راہ روی بھی نہیں۔ ایک بے کیفی ہے۔
سیٹھا پن ہے۔ بے بات کی بات ہے مثلاً اس قسم کے اشعار
فردہ طینتی دکا بلی سے ہم نے کبھی شباب میں بھی نہ دیکھی دکا بن بادہ فروش

شیفۃ کا مشہور ترین شعر یہ ہے

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفۃ اک آگ سی ہے سینہ کے اندر لگی ہوئی

مجھے یقین ہے کہ یہ شعر زیادہ اس لئے مشہور ہوا کہ اس میں شیفۃ کا تخلص موجود ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو خود شیفۃ اتنے مشہور نہ ہوتے
اور ان کا یہ شعر بہتر ہے اچھے اشعار کی طرح مشہور ہو جاتا جن کے شاعر کے نام عام طور سے لوگ نہیں جانتے مثلاً یہ شعر
میں اور اذن بادہ کشی لے گئیں مجھ یہ کم نکا ہیاں تری بزم شراب میں
صد سا کہ دور چرخ تھا سا غر کا ایک دور نکلے جو میکہ سے تو دنیا بدل گئی
بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ یہ اشعار کس کے ہیں۔ شیفۃ کا نہ کوہ ہالا شعر مفرد شعر ہے۔ کسی غزل کا شعر نہیں ہے، اس لئے

ظاہر ہے کہ اسے اچھا ہی ہونا تھا۔ دراصل راقم الحروف کے خیال میں اس شعر کی تحریک شیفۃ کے معاصر بلکہ ان کے رفیق و جلیس حالی کا ایک شعر ہے جس کا پہلا مصرع یہ ہے۔

عشق کہتے ہیں جسے سب وہ یہی ہے شاید

عشق کہتے ہیں جسے سب وہ یہی ہے شاید

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفۃ

اب رہا دوسرا مصرعہ تو وہ تیر کے ایک مصرع کی صدا ہے باز گشت ہے

اک آگ سی لگی ہے کیا جانے کہ کیا ہے

اک آگ سی ہے سینہ کے اندر لگی ہوئی

”اک آگ سی“ ہے کا پورا ٹکڑا چنی کھا رہا ہے۔

صلاح الدین صاحب نے بھی شیفۃ کے مشہور ترین اشعار کی بنیاد پر اپنے نقد تبصرے کی عمارت کھڑی کی ہے جو بس دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ میں اس پر کوئی بحث کرنا نہیں چاہتا، وہ کچھ کہتے ہیں، شیفۃ کا دیوان کچھ کہتا ہے۔ جب میں نے اپنے ایک نقاد دوست نظیر صدیقی سے شیفۃ کے بارہ میں اپنے خیالات ظاہر کئے اور ان کے خیالات پوچھے تو انھوں نے مجھے لکھا کہ شیفۃ کو دبستان لکھنؤ میں شامل نہ کرو، ہاں تیسرے درجے کے شاعر ضرور ہیں، جناب حامد علی خاں مدیر انجمن نے مجھے اپنے ایک خط میں لکھا کہ:-

”شیفۃ کے بارہ میں آپ کی رائے دلچسپ ہے۔ میں نے بھی یہی رائے قائم کی تھی مگر اتنی سختی سے نہیں۔ میں نے کہا تھا

کہ ان کے اچھے اشعار بہت کم ہیں۔ دہلی ریڈیو اسٹیشن سے شعراء کے کلام کا انتخاب میرے سپرد تھا۔ ناسخ کی طرح ان کے اچھے

شعریں چند ہی تھے۔ شیفۃ کو زبردستی آپ لکھنؤ سے کیوں وابستہ کرتے ہیں جبکہ ان کی شاعری دہلی کی پیداوار ہے۔“

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ حامد علی خاں صاحب بھی شیفۃ کے سلسلہ میں ناسخ کا نام کسی عنوان سے لے ہی بیٹھے۔ حامد علی خاں صاحب نے غالب کے ان اشعار کی طرف میری توجہ مبذول کرائی ہے جو انھوں نے شیفۃ کی سخن فہمی اور سخن گوئی کے متعلق کہے ہیں۔

(۱) غالب زحصر قی چہ سرائی کہ در غزل چوں او تلاش معنی و مضمون نہ کردہ کس

(۲) غالب بہ فن گفتگو نازد بدیں ارزش کہ او نوشت در دیوان غزل تا مصطفیٰ خاں خوش نکرد

مجھے کہہ لینے دیجئے کہ غالب کی رائے قطعی (۱) اہم نہیں۔ وہ لوگوں کو خوش کرنا اور خوش رکھنا جانتے تھے خصوصاً ان کو جن سے ان کی توقعات وابستہ ہوتے۔ غالب زمانہ ساز انسان تھے۔ ان کا کردار کوئی بلند کردار نہ تھا۔ ان کی اخلاقی کمزوریوں کے واقعات سے انکی زندگی کے حالات بھرے پڑے ہیں۔ مدح و ستائش کا ان کو خاص ملکہ تھا۔ اخلاقی دلیری (Moral Courage) سے وہ محروم تھے۔ مرزا حبیب علی سرور سے ”فسانہ عجائب“ کے متعلق یہ کہہ دیا کہ یہ جہل ترین طرز نگارش کا کھل نمونہ ہے اور جب انھیں کسی نے بتایا کہ ان کی گفتگو کے مخاطب سرور ہی تھے تو ان کے گھر گئے اور بہت ساری باتیں بناتے ہوئے یہ فتویٰ دے دیا کہ اعلیٰ طرز نگارش دیکھنی ہو تو کوئی سرور کی ”فسانہ عجائب“ دیکھے۔ وہ بہت غلو سے کام لیتے تھے۔ ناسخ کی داد انھوں نے اس بلند ہنگی سے دی ہو کہ بس نواب صاحب تو پھر نواب صاحب تھے، انھوں نے ”ستم پیشہ ڈومنی“ کے ذوق سخن کا وہ چرچا کیا کہ اگر وہ ان کے پیچھے چڑھ جاتی تو غالب اسے ”باکمال شاعرہ“ بنا کر دم لیتے غالب ہر اس شخص کے مدح تھے جو ان کے کلام کا مدح تھا۔ وہ شیفۃ کی داد دیتے تھے نواب صاحب طے خاں کی داد دیتے تھے اور اگر تھوڑی دیر کیلئے غالب کے دونوں مذکورہ بالا اشعار کو ہم سمجھ گئی سے قبول بھی کر لیں تو ان اشعار سے یہ کب ظاہر ہوتا ہے کہ شیفۃ اچھے شاعر تھے۔ میں حامد علی خاں صاحب سے پھر عرض کر دوں گا کہ سخن فہمی اور سخن گوئی ایک دوسرے کا معیار نہیں ورنہ آج حضرت جوش ملیح آبادی بہت بڑے نقاد بھی ہوتے اور علامہ نیاز فتح پوری بہت بڑے شاعر بھی۔ جہاں تک شیفۃ کی سخن گوئی کے متعلق غالب کے شعر کا تعلق ہے وہ ”داد“ کم ہے اور

”بیداد“ زیادہ اور خود مجھے غالب کی اس رائے سے اتفاق کرنے میں عذر نہ ہو گا کہ :-

چوں او تلاش معنی و مضمون نہ کردہ کس

لیکن غور کرنے کا مقام ہے کہ کیا شاعری ”تلاش معنی و مضمون“ کا نام ہے؟ کیا سخن وری وقت کاٹنے کا ایک شغل ہے یا یہ تلاش و جستجو اور صیقل و شکار کی قسم کی کوئی تفریح ہے؟ - معنی و مضمون کی تلاش کا نام شاعری نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو میر و غالب کو کوئی نہ جانتا اور انشا و مصحفی کا سکہ چلتا اور اردو کا سب سے بڑا شاعر ناسخ ہی کہا جاتا۔ شاعری احساسات و جذبات کی زبان ہے۔ فکری شاعری کے لئے ضروری ہے کہ تخلیل نے احساس کی دھمک محسوس کی ہو۔ نری فکر اور گمراہ فکر محض ذہنی ورزش اور تضحیح اوقات ہے اور کچھ نہیں۔ شیفتہ کے رنگ سخن کو محض اس لئے لکھنوی رنگ نہ کہنا کہ وہ دلی کی پیداوار ہے ایک عجیب و غریب منطق ہے۔ لکھنؤ اور دہلی کی تقسیم دنیا کے شعر میں محض جغرافیائی حد بندی نہیں، یہ تو مدرستہ فکر (School of thought) کی تقسیم ہے۔ لکھنؤ اور خاص لکھنؤ کے شعراء نے بھی دہلی کے طرز کو اپنایا ہے اور دہلی کے شعراء نے بھی دہلی کے طرز کو اپنایا ہے اور دہلی کے شعراء نے لکھنؤ رنگ سخن سے مبراہ کیا ہے۔ لکھنوی رنگ سخن ایک مخصوص رنگ سخن ہے۔ اگر پاکستان کا کوئی منفی انگریزی دھن بجائے تو کیا وہ دھن اس لئے کہ پاکستان میں بجائی جا رہی ہے پاکستانی ہو گئی؟ شیفتہ جے ہوئے تو ہیں خواں دہلی پر لیکن لکھنوی ذائقے پر ان کی رال ٹپکتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ شیفتہ فطری شاعر نہ تھے اور ان کو غالب و مومن کی صفت میں جگہ دینی ایک قسم کی انتقادی غلط بخشی اور منصب شناسی

پر وفیسر ارشد کا کوئی

ہوئی۔

چند نایاب کتابیں

آثار الصنادید (سریہ) - قاموس المشاہیر حصے (نظامی ہائیڈ) - تذکرہ آبجیات (آداد) - مرقع چغتائی ۱۲۷۵ء۔

کلیات نظیر و سوانح عمری نظیر (پروفیسر شہباز) - مطلع العلوم و مجمع الفنون (داجہ علی) - تنقیح اللغات (جلال لکھنوی) - بحر الفصاحت (نجم الغنی) ۱۲۷۵ء۔

مخزن نکات (تذکرہ قائم) - چمنستان شعراء (تذکرہ) - منتخب کلیات ظفر (بیادشاہ ظفر) - کلیات نظم و نثر سعدی (شیخ مصباح الدین سعدی) - ۱۲۷۵ء۔

دریائے لطافت (میر انشاء اللہ خاں) - فسانہ عجائب (مزار جب علی بیگ سرور) - شگوفہ محبت حصہ دوم فسانہ عجائب (مزار جب علی بیگ سرور) ۱۲۷۵ء۔

احیاء العلوم (مذاق العارفین اردو) - مترجم محمد حسن - کیمیائے سعادت فارسی (امام خروانی) - وقایع سیر و سیاحت (مترجم محمد حسین) - ۱۲۷۵ء۔

سفر نامہ شیخ ابن بطوطہ (ترجمہ نواز شمس علی خاں اردو) - تاریخ سلاطین فاطمیہ (ذاکر حسین) - تاریخ فرخ آباد بہر دو حصہ (مشرع ولیم آرون صاحب) ۱۲۷۵ء۔

منتخب لغات عثمانیہ (فارسی و ترکی و عربی) - کشف اللغات (عبدالرحیم حصہ ۲) - لغت اردو و فارسی سے انگریزی (اول و آخر صفحات پر شابان اوصہ کی مہر) ۱۲۷۵ء۔

نگار رنگ اکھنسی لکھنؤ

نقوش و علامات ہو سکتی ہیں جنہیں اظہار تصرف یا امتیاز کے لئے برتنوں وغیرہ پر بنایا جاتا تھا ایسے نشانات بحیرہ روم کے تمام ممالک میں حروف تہجی کی ایجاد سے پہلے مروج تھے۔

بہر حال یونانی سے متعلق جو خط ایشیائے کوچک میں مستعمل تھے انہیں اب مجموعی طور پر (Asianic Alphabets) کہا جاتا ہے۔

(ملاحظہ ہو نقشہ نمبر ۲۲) - نیچے اُن کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) لیکیا کا خط (Lycian) لیکیا کی ایک قدیم قوم تھی جو ایشیائے کوچک کے جنوبی مغربی حصے میں آباد تھی۔ اس کا تیرھویں صدی ق۔ م کی مصری یادگاروں میں لوگو یا رو کو کے نام سے ذکر ہے۔ ان کے لئے لکی نام ترقی یا ترقی تھا۔ جن کا ہیروڈوٹس نے ترمیلانی یا ترمیلانی کے نام سے ذکر کیا ہے۔ یونانی روایت کے مطابق وہ جزیرہ کریٹ کے مہاجر تھے۔ ممکن ہے ایسا ہو لیکن اُن کا تعلق ہند یورپی زبان بولنے والوں سے نہ تھا بلکہ اُن کی زبان جنوبی کاشیتی کی ایک شاخ تھی۔

پانچویں اور چوتھی صدی ق۔ م کے تقریباً ۵۰ لیکیا کی کتبے اور اسی زمانہ کے کچھ سکے موجود ہیں۔ خاص کتبہ جو ایک متون پر کندہ (Xanthos) میں ملا تھا برٹش میوزیم میں محفوظ ہے۔ یہ ۲۵۰ سطروں پر مشتمل ہے۔ اسے ابھی تک ٹھیک سے پڑھا نہیں جاسکا ہے۔ دوسرے کتبے جن میں چند یونانی اور لیکیا کی دو زبان والے کتبے (Bilinguals) بھی شامل ہیں۔ تجزیہ و تکفین سے متعلق ہیں۔ اس خط میں ۲۸ حروف کام آتے تھے، ۱۴ حروف صحیح تھے جو آ اور تھ کے نشانات (+) () کو چھوڑ کر یونانی الاصل تھے۔ اور ۱۴ حروف علت جن میں سے صرف چار (AEIO) یونانی ہیں اور بقیہ غیر یونانی۔ یہ خط فریجیائی اور سیمیٹی سے مشابہ ہے جیسا کہ ان حروف (FFPY) کی اشکال سے ظاہر ہے۔ اس میں یونانی حروف ایسی لان کا نہ پایا جاتا اس خط کی قدامت کا ثبوت ہے۔ چوتھی صدی ق۔ م میں سکندریہ کی فتوحات کے بعد اس خط کی جگہ یونانی نے لے لی۔

(۲) فریجیہ کا خط (Phrygian) ۸ ویں صدی ق۔ م میں فریجیہ کی حکومت ایشیائے کوچک میں سب سے طاقتور تھی جو دریائے ہلیس (R. Halys) کے مغرب میں واقع تھی۔ اہل فریجیہ ہیروڈوٹس اور سترٹیو کے بیانات کے مطابق تھریس کے مہاجر تھے جہاں تک ہمیں اُن کی زبان کا علم ہے وہ اگرچہ تھوڑا ہے لیکن اس خیال کی تائید میں ہے۔

اس خط کو (Lassen) نے اُن کتبوں کی مدد سے پڑھا تھا جو (Prymnessus) کے ساتھ چٹانی مقبروں پر کندہ ہیں۔ اُن میں سے ایک پر مشہور بادشاہ میڈاس (Midas) کا نام کندہ ہے۔ ان کتبوں کے حروف قدیم یونانی سے مشابہ ہیں چنانچہ یونانی اور رومی کی اشکال (P P P) وہی ہیں جو تھریس میں پائی جاتی تھیں۔ اسی طرح آیف کا نشان (F) بھی اس خط کی قدامت کا ایک ثبوت ہے کیونکہ یہ حرف آ یونی خط سے ساتویں صدی ق۔ م میں غائب ہو گیا تھا۔ برابری بنا اس خط کا زمانہ آٹھویں سے چھٹی صدی ق۔ م مقرر کیا جاتا ہے۔ بعد میں اس قدیم خط کی جگہ خالص یونانی خط نے لے لی جیسا کہ رومی عہد کے فریجیائی کتبوں سے ظاہر ہے۔

(۳) سیمیٹیہ کا خط (Pamphylian) سیمیٹیہ جنوبی مغربی ایشیائے کوچک میں لیکیا اور سلیسیا کے مابین واقع تھا۔ یہاں کے لوگ جو مخلوط النسل تھے ہمیں باہر سے آئے تھے۔ ان کا رسم خط یونانی الاصل تھا جس میں چند غیر یونانی نشانات کا اضافہ کیا گیا تھا۔ اس خط کا ایک طویل کتبہ اور چند سکے موجود ہیں۔ زمانہ مابعد میں یہ لوگ یونانی اور آرمینی خط کی ایک مرکب صورت استعمال کرنے لگے۔

(۴) لیڈیا کا خط (Lydian) لیڈیا کی ریاست ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل پر واقع تھی اس کے شمال میں میڈیا اور جنوب میں کیریا تھا۔ حکومت فریجیہ کے زوال کے بعد خصوصاً ساتویں اور چھٹی صدی ق۔ م میں یہ ریاست سب سے طاقتور تھی۔ کرویٹس (Croesus) لیڈیا کا آخری بادشاہ تھا جس نے شاہ ایران سائرس (Cyrus) کے ہاتھوں ۵۴۶ ق۔ م میں شکست کھائی۔

لیڈیا کی تہذیب کافی پُرانی تھی۔ اس امر کا تعین کرنا مشکل ہے کہ یہ لوگ کہاں سے آئے تھے۔ زمانہ حال کے متعدد عالموں کو لیڈیائی اور ایٹریکی زبانوں میں مشابہت نظر آتی ہے اگرچہ اب تک دونوں زبانیں یقینی طور پر پڑھی نہیں جاسکی ہیں۔ بہر حال لیڈیا والوں کی زبان کا تعلق

ہند یورپی زبانوں سے نہ تھا اگرچہ قواعد اور بعض دوسری باتوں میں وہ آخر الذکر سے ملتی جلتی تھی۔

تقریباً ۵۰ لیبائی کتب دریافت ہو چکے ہیں جن میں سے ۳۶ امریکی ماہرین حفريات نے ۱۳-۱۹۱۰ء میں سارڈوس کی کھدائی میں حاصل کئے تھے جو لیڈیا کا پرانا دار الحکومت تھا۔ جن کتبوں کا زمانہ یقین کے ساتھ متعین ہو سکا ہے ان میں سے بعض چوتھی صدی ق۔ م کے اور بعض پانچویں صدی ق۔ م یا اس سے بھی پہلے کے ہیں۔ بیشتر کتبہ تھیرودگفین سے متعلق ہیں۔

لیڈیا والوں کی زبان کا علم ہمیں بعض دو زبانوں والے کتبوں سے حاصل ہوتا ہے۔ لیڈیائی اور آرامی کا ایک طویل کتبہ پانچویں یا چوتھی صدی ق۔ م کا ہے۔ ایسا ہی ایک چھوٹا کتبہ ۱۹۱۱ء میں فلاکارا (وادی کیسٹروس) میں ملا تھا، لیڈیائی اور یونانی کے بھی بعض دو زبانوں والے چھوٹے کتبے موجود ہیں۔

لیڈیائی خط یونانی کی ایک شاخ تھا۔ عموماً دائیں سے بائیں کو لکھا جاتا تھا۔ اس میں ۲۶ یونانی حروف کے سوا لیڈیا والوں کی اپنی مخصوص آوازوں کے لئے بعض نشانات کام آتے تھے جن کیلئے یونانی میں نشانات نہ تھے۔ ان میں سے بعض کے تلفظ کا علم ہمیں نہیں ہے اور ان کا اخذ ہی معلوم ہے (ممکن ہے مقامی نشانات ہوں) ایف کی آواز کے لئے لیڈیائی خط میں انگریزی کے آٹھ (8) سے مشابہ ایک حرف پایا جاتا تھا جو ایٹریک خط میں بھی نظر آتا ہے۔

(۵) کیریائی کا خط (Carian) کیریا، ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل پر لیڈیا کے جنوب میں اور لیکیا کے مشرق میں واقع تھا۔ قدما کا خیال تھا کہ اہل کیریا متعدد جزائر ایجین اور خود یونان خاص میں آباد تھے۔ ان کی نسلی اور لسانی مشابہتوں کے بارے میں ہمارا علم نا کافی ہے لیکن یونانی روایت کے مطابق وہ جزائر ایجین کے مہاجر تھے اور یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے۔ ان کی زبان کا تعلق یقیناً ہند یورپی زبانوں سے نہ تھا۔ بعض باتوں میں وہ لیکیا سے مشابہ تھے۔ ممکن ہے یہ لوگ مخلوط نسل ہوں۔ انھیں ان کے ایک حصہ کو لیجیر (Leleges) کہتے تھے اور ان کا ایک جزو جو کوئی (Caunian) کہلاتا تھا ایک خاص بولی رکھتا تھا۔

تقریباً ۸۰ کیریائی کتبے موجود ہیں جن میں سے قدیم ترین ساتویں صدی ق۔ م کے وسط کے ہیں۔ ان میں سے بیشتر کو دریائے نیل کے بالائی حصہ کی یادگاروں پر کیریا کے سپاہیوں نے جو فرعون مصر کے ملازم تھے اپنے ناموں کی صورت میں کندہ کیا تھا۔ ابوسمبل (مصر کے جنوب) میں فرعون مہر رمیسیس دوم کا چٹان میں بنوایا ہوا مشہور مندر ہے جس کے سامنے چار بت ۶۶ فیٹ اونچے پتھر سے تراش کر بیٹھے ہوئے بنائے گئے ہیں جن میں مختلف رسوم خط میں سپاہیوں نے اپنی تحریریں چھوڑ دی ہیں جن میں سے بیشتر ان کے نام ہیں، خاص تحریروں میں ۶ فنیقی، ۱۹ یونانی اور ۳ کیریائی کتبے ہیں۔ یونانی حروف کو نقشہ نمبر ۱۹ میں نقل کیا جا چکا ہے۔ فنیقی کتبہ کسی حد تک پڑھ لئے گئے ہیں، کیریائی خط کو ما نہیں جاسکا ہے۔ کیریائی کے چار کتبے ایبائڈس میں ملے ہیں اور دوسرے کتبہ میفس اور بوباس میں پائے گئے ہیں۔ خود کیریا میں ایک لائے فلیج اسکو تپا میں گرا کے ایک مقبرے پر کندہ ہے۔ بعض مصری کیریائی دو زبانوں والے کتبے بھی موجود ہیں۔ کیریائی زبان کا مکمل علم حاصل نہ ہونے کی وجہ سے ان کتبہ کو ابھی تک وثوق کے ساتھ پڑھا نہیں جاسکا ہے۔

بہر حال کیریائی خط میں تیس یا چالیس نشانات کام آتے تھے جن میں سے تقریباً نصف یونانی تھے اور نصف جو لیبیا پر سلیبل (Syllable) معلوم پڑتے ہیں یا تو مقامی الاصل تھے اور یا پھر قریبی رسم خط کریٹ کی کھائی سے ماخوذ تھے۔

نتیجہ - مذکورہ بالا خطوں میں اول تین براہ راست یونانی خط پر مبنی تھے اور آخر وہ کسی حد تک یونانی سے رشتہ رکھتے تھے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان کے سوا ایشیائے کوچک میں اور بھی یونانی الاصل رسوم خط مستعمل تھے۔ بعض عالموں نے میسیا (Mysia) سیلیسیا (Cilicia) اور کیپاڈوکیا (Cappadocia) کے خطوں کا بھی ذکر کیا ہے، لیکن ان کے وجود کو ثابت کرنے کے لئے کافی شواہد موجود نہیں ہیں۔ تھوٹے سے کتبے ہیں جن میں سے بعض کا رسم خط مخلوط ہے اور بعض کو ابھی تک پڑھا نہیں جاسکا ہے۔

قبلی خط (Coptic) یونانی خط کی ایک اور غیر یورپی اولاد افریقہ کا قبلی رسم خط تھا جس کا عربی نام قبط (یا قبط) یونانی ایجیپٹس

(Aigyptios) یا جپٹس (gyptios) کی بگڑی ہوئی صورت ہے اور عربی ہی سے انگریزی نام کا ٹپک (Coptic) انخوڑے۔ آج کل قبط کا لفظ ملک مصر کی اُس آبادی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جو ۶۴۱ء میں عربوں کی فتح مصر کے بعد بھی عیسائی مذہب پر برقرار رہی اور جس نے قبطی زبان کو (جو قدیم مصری زبان کی آخری صورت تھی) تحریر و تقریر کے ذریعہ تیرھویں صدی تک زندہ رکھا۔ (اگرچہ اُس کا استعمال سترھویں صدی تک برقرار رہا لیکن بہت ہی کم) اور پھر وہ محض قبطی کلیسا کی زبان ہو کر رہ گئی جب عربی زبان کو روزانہ زندگی کے کاموں میں استعمال کے لئے اختیار کر لیا گیا۔ کسی حد تک قبطی زبان بالائی مصر کے عیسائی دیہاتوں میں اب بھی مستعمل ہے اور زینی یاہ کہلاتی ہے۔

قبطی کی پانچ خاص بولیوں میں سب سے اہم دو تھیں (۱) سعیدی بولی جو جنوبی یا بالائی مصر میں پرانے دار الحکومت تھیبس (موجودہ کسر) کے اطراف میں بولی جاتی تھی (۲) نشیبی مصر کی بولی یا نری جو قبطی کلیسا کی زبان بن گئی (کیونکہ اسکندریہ قبطی اسقف کا صدر مقام تھا) اور دوسری بولیوں کو اپنے سامنے سے خارج کر دیا۔

بعض قبطی مسودے اور کتبے دوسری اور تیسری صدی عیسوی کے ہو سکتے ہیں لیکن قدیم ترین مخطوطات جن کا زمانہ یقین کے ساتھ متعین کیا جاسکتا ہے پانچویں صدی عیسوی کے ہیں۔ قبطی رسم خط بتیس حروف پر مشتمل تھا جن میں سے کچھیں یونانی کے بڑے حروف ہیں اور سات دیویتی رسم خط کی ایک گھسیٹ صورت سے ماخوذ ہیں اور ان آوازوں کو ظاہر کرتے ہیں جو یونانی میں نہ تھیں (ملاحظہ ہو نمبر ۲۳)۔

نوبیا کا خط۔ نوبیا کا ملک مصر کے جنوب میں ہے یہاں کے قدیم باشندوں نے قبطی رسم خط اختیار کر لیا تھا جس میں انہوں نے میرے رسم خط سے تین نشانات کا اضافہ کیا تھا۔ یہ ان آوازوں کو ظاہر کرتے تھے جن کے لئے قبطی میں علامات نہ تھیں۔ نوبیا کے رسم خط میں گیسے ہوئے عیسائی مسودات کے نامکمل اجزاء دسویں اور گیارھویں صدی عیسوی کے ہیں۔ ان میں سے کچھ برٹش میوزیم (لندن) میں ہیں اور کچھ برلن میں۔

گوٹھ کی خط (Gothic) گوٹھ لوگ (Goths) جو ویسی گوٹھ (Visi Goths) یا مغربی گوٹھ بھی کہلاتے ہیں ٹیوٹانی نسل تھے۔ ٹیوٹانی قوم میں وہ پہلے لوگ تھے جنہوں نے عیسائی مذہب قبول کیا۔ چوتھی صدی عیسوی میں وہ موجودہ بلغاریہ میں آباد تھے۔ ان کے مذہبی رہنما اُلفلا (Ulfila) کا بھی یہی زمانہ ہے جس نے ۳۸۱ یا ۳۸۳ عیسوی میں وفات پائی۔ دراصل وہ ایشیائے کوچک کا باشندہ تھا جب وہ چھوٹا تھا تو مغربی گوٹھ اُسے گرفتار کر کے ڈینیوب ندی کے شمال کو لے گئے مگر اُس نے بہت جلد لاطینی اور یونانی زبانیں سیکھ لیں اور ایرس (Arius) کا پیرو بن گیا جس نے مصر میں عیسائی مذہب کی ایک نئی شاخ قائم کی تھی (یورپ اور اُس کے پیرو ایرس اور اُس کے قبیحین کو کافر کہہ کر پکارتے تھے) اُس نے بائبل کا ترجمہ گوٹھ کی زبان میں کیا لیکن "سلاطین کی کتابوں کو چھوڑ کر کیونکہ وہ محض فوجی کارنامے ہیں اور گوٹھ قبائل جنگ کے بڑے شوقین تھے"۔ اُلفلا کے ترجمہ کے بعض اجزاء پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی کے مسودات میں موجود ہیں جن میں اہم ترین (Codex Argenteus) ہے جو ارغوانی سرخ چرمی کاغذ پر سونے چاندی کے حروف میں لکھا ہے کل ۸۶ صفحات ہیں جو اُپسلا (سوئیڈن) میں محفوظ ہیں۔ ان میں ٹیوٹانی زبان کی قدیم ترین صورت نظر آتی ہے۔ بہر حال اس ابتدائی گوٹھ کی تہذیب نے جس کی مخصوص زبان اور رسم خط تھا بعد کی جرمن تہذیب پر اپنا ذرا سا بھی اثر نہیں چھوڑا ہے۔

اُلفلا نے اپنی تحریروں میں ایک خاص خط استعمال کیا ہے جو گوٹھ کی یا میسو گوٹھ کی (Meso Gothic) کہلاتا ہے۔ دراصل وہ اُس کی اپنی ایجاد تھا کل ستائیس نشانات تھے جن میں سے انیس یا بیس یونانی کے بڑے حروف تھے، پانچ یا چھ لاطینی سے لئے گئے تھے۔ (لیکن قدرے تغیرات کے بعد) اور شاید دو نشانات یا تو رومی خط سے ماخوذ تھے یا اُس کی اپنی ایجاد تھے۔ (ملاحظہ ہو نقشہ نمبر ۲۴) اس گوٹھ کی خط کی ایک گھسیٹ صورت بھی تھی جیسا کہ نیپلس کے قومی کتب خانے کی ایک دستاویز سے ظاہر ہے علاوہ انہیں ویانا کے کتب خانے میں بھی ایک مسودہ ہے جس میں گوٹھ کی گھسیٹ حروف نظر آتے ہیں۔ (باقی)

محمد اسحاق صدیقی

۱۔ ملاحظہ ہو نکار بابت ستمبر ۱۹۵۷ء۔ ۲۔ یہ اُس گوٹھ کی خط سے بالکل ہی مختلف تھا جو لاطینی خط کی ایک قسم ہے اُس کا ذکر آگے کیا جائے گا۔

آواز	مغربی یونانی	فریجیائی خط	ہیفیلی خط	لیکیائی خط	لیڈیائی خط	کیریائی خط
ا	ΑΑ	ΑΑ	Α	Α	Α	Α Δ Ρ δ λ
ب	Β	ΒΒ	Β	Β ~	Β	δ β
ج	Γ	Γ	Γ	Γ γ	Γ	Γ < []
د	Δ	Δ	Δ	Δ	Δ	Δ
ا (e)	ΕΕ	Ε Ε	Ε	Ε	Ε	Ε Ε ε ε ε
و	Ζ	Ζ Ζ	Ζ η	Ζ	Ζ	Ζ Ζ ζ ζ ζ
ز	Η	√ √ ζ ζ ζ	Η Η	Η	Η	Η Η
ی	Ι	Ι	Ι	Ι	Ι	Ι Ι
ک	Κ	Κ Κ	Κ	Κ	Κ	Κ Κ κ κ
ل	Λ	Λ	Λ	Λ	Λ	Λ Λ λ λ
م	Μ	Μ Μ Μ	Μ	Μ Χ ?	Μ	Μ Μ
ن	Ν	Ν Ν	Ν ξ	Ν Ξ ?	Ν Ξ ?	Ν Ν Ν Ν
او (o)	Ο	Ο Ο Ο	Ο	Ο	Ο	Ο ο
پ	Ρ	Ρ Ρ Ρ Ρ	Ρ	Ρ	Ρ	Ρ ρ ρ ρ
ر	Σ	Σ Σ Σ	Σ	Σ	Σ	Σ Σ Σ Σ
س	Τ	Τ	Τ	Τ	Τ	Τ Τ Τ Τ
ث	Υ	Υ Υ	Υ	Υ	Υ	Υ Υ Υ Υ
یو (u)	Φ	Φ	Φ	Φ	Φ	Φ Φ Φ Φ
چ	Ψ	Ψ Ψ	Ψ	Ψ	Ψ	Ψ Ψ Ψ Ψ
خ	Χ	Χ Χ	Χ	Χ	Χ	Χ Χ Χ Χ

نقشہ نمبر ۲۳	عربی قیمت	آواز	تلفظ	یونانی کے بڑے حروف	قبلی حروف	عربی قیمت	آواز	تلفظ	یونانی کے بڑے حروف	قبلی حروف
پ	۸۰	پ، ب	پانی، پانی	Π π	Π	۱	ا	انفا	Δ δ	Δ
۱۰۰	۱۰۰	ر	رو	Ρ ρ	Ρ	۲	ب، و	بیٹا، ویٹا	Β β	Β
۲۰۰	۲۰۰	س	سی	Σ σ	Σ	۳	ج	گا	Γ γ	Γ
۳۰۰	۳۰۰	ت	تاؤ، داؤ	Τ τ	Τ	۴	د	ڈیٹا، ڈیٹا	Δ δ	Δ
۴۰۰	۴۰۰	ای، او	ہے	Υ υ	Υ	۵	ای	ای	Ε ε	Ε
۵۰۰	۵۰۰	پھ	پھی	Φ φ	Φ	۶	سو	س	Ζ ζ	Ζ
۶۰۰	۶۰۰	کھ	کھی	Χ χ	Χ	۷	ز، س	زیٹا، زیٹا	Η η	Η
۷۰۰	۷۰۰	پس	پسی	Ψ ψ	Ψ	۸	ای	ہیٹا، ہیٹا	Θ θ	Θ
۸۰۰	۸۰۰	او	او، او، یو	Ω ω	Ω	۹	تھ	تھیٹا	Ι ι	Ι
ش	(۹۰۰) شے ای	ش	شے	Σ σ	Σ	۱۰	ای، ج	ایٹا، جوڈا	Κ κ	Κ
ف	(۹۰۰) فے ای	ف	فے	Υ υ	Υ	۲۰	ک	کاپا، کاپا	Λ λ	Λ
ح	حے ای	ح	حے	Τ τ	Τ	۳۰	ل	لوڈا، لولا	Μ μ	Μ
و	وے ای	و	وے	Σ σ	Σ	۴۰	م	می، مے	Ν ν	Ν
ج، دج	گنجا، گنجا	ج، دج	جے، ڈے	Χ χ	Χ	۵۰	ن	نی، نے	Ξ ξ	Ξ
س، ٹ	سیکا	س، ٹ	سے، ڈے	Ω ω	Ω	۶۰	کس	کسی، کسی	Ο ο	Ο
ٹی	ڈیٹے ای	ٹی	ڈے	Τ τ	Τ	۷۰	او	او، او		

(ہر اعلیٰ، ہر اعلیٰ، دیکھو جی)

عربی قیمت	آواز	علامات	عربی قیمت	آواز	علامات
۱۰۰	۱۰۰	۱	۱	۱	۱
۲۰۰	۲۰۰	۲	۲	۲	۲
۳۰۰	۳۰۰	۳	۳	۳	۳
۴۰۰	۴۰۰	۴	۴	۴	۴
۵۰۰	۵۰۰	۵	۵	۵	۵
۶۰۰	۶۰۰	۶	۶	۶	۶
۷۰۰	۷۰۰	۷	۷	۷	۷
۸۰۰	۸۰۰	۸	۸	۸	۸
۹۰۰	۹۰۰	۹	۹	۹	۹

مولانا شاد عظیم آبادی کا ایک مکتوب

نواب عماد الملک بلگرامی کے نام

(عظیم نواب ہوشیار جنگ)

جناب آقائے محترم سرور معظم یادگار اسلاف مایہ نازش اخلاف روحی فدراکم

گرامی نامہ پڑھتا جاتا تھا اور روتا جاتا تھا۔ محبت بھرے الفاظ دل کے ٹکڑے کئے دیتے تھے، اللہ اللہ آپ کون ہیں کیا ہیں؟ وہی دل سمجھ سکتا ہے جو ساٹھ ستر برس سے دیکھنے والا ہے، بے شک آپ اس نظر سے کہ کئی کئی زبانوں کے ادیب منفرد اور علامہ وقت ہیں، زمانہ جس قدر آپ کی مدح و ثنا کرے کم ہے مگر حالت یہ ہے کہ ”ورائے شاعری چیزے دگر بہت“ — آپ میں خاص کر کے (بہی چیزے دگر) ایسی بے مثل صفت ہے جس کی نظیر خود آپ ہی آپ ہیں، اللہ تعالیٰ اتنے دنوں تک جناب کو بصحت و عزت سلامت رکھے کہ میرا مرنا دیکھ لیجئے۔

میرے مخدوم اس نا پر سارا اور ناقدر شناس شہر میں رہ کر ساٹھ برس تک محنت و ریاضت سے کام لینا فقط مجھ بے حیا کا کام تھا۔ اس مشقت و ریاضت ہی کی بدولت میں نے اپنی مالی حالت کو ایسا نقصان پہنچا یا ہے کہ اللہ ہی اس کی تلافی کرے، تو ہو۔ مختصر یہ ہے کہ دس بارہ برس اُدھر جب میں نصاب تعلیم کی ساتوں کتابیں لکھ رہا تھا (جس کی مختصر حالت اس نیاز نامہ کے نوٹ کے ہمراہ ہے) تو میرا کارندہ جو نہایت قدیم و معتمد علیہ تھا چند طریقہ سے قریب ساٹھ ہزار کے غبن کر گیا، ہنوز میں تصنیف سے فارغ نہیں ہوا تھا اور بالکل بے خبر تھا کہ انگلزی سرکاری میں اُس نے عہد آتی کر کر تین ہزار بجت کا ایک موضع نیلام کروا دیا حکام نے کوئی عذر میرا نہ سنا، غرض کہاں تک اس بے ضرورت باتوں کو عرض کروں، اب تک غالباً تین لاکھ روپوں کا نقصان ان تصنیفوں میں منہمک رہنے کی بدولت اُسٹھا چکا ہوں۔ چونکہ میرا ایک ہی لڑکا دائم المرض تھا اور بی بی مرچکی تھی اس نقصان کی بھی کچھ پروا نہ تھی جو کچھ باقی رہ گیا تھا میرے اور اس لڑکے کے لئے بہت کافی تھا اس لڑکے کی شادی بھی اچھی جگہ سمجھا گل پور میں ہو گئی تھی یعنی عمدہ بیگم کی نواسی سے جن کی دونو سیاں مرزا آسماں جاہ فرزند حضرت واجد علی شاد مرحوم مٹیا برج سے ہوئی تھی، امید تھی کہ اس لڑکے کی لمبی کیل کو ترکہ سے بارہ تیر ہزار سال کی آمدنی ملے گی مگر دو سال ہوئے یہ لڑکی تین بیٹیاں اور دو بیٹے چھوڑ کر اپنی ماں کی زندگی میں مر گئی اور یہ پانچوں بچے ترکہ سے محروم ہو گئے تانی بھی ان کی محزون ہیں یہ سب میرے گلے پڑے، ان کے باپ میرا دوام مرض کے سبب سے صلاحیت نہیں گھر کے اندر بجز معمولی ملازمت کے کوئی عورت نہیں لڑکیاں ناکہ خدا جن میں دو قابل شادی میری زندگی آخر — اب ان نقصانات کا خیال کر کے خود اپنے اوپر اور ان تصنیفوں کے ڈھیر غصہ آتا ہے، بعض دفعہ تنگ ہو کر یہ ارادہ ہو جاتا ہے کہ جس کی بدولت یہ سب نقصان ہوئے سب کو ڈھیر لگا کر آگ لگا دوں۔ پہلے فقط اپنے اوپر اس لڑکے کے کھانے میں ایک سو روپے ماہانہ کا خرچ تھا کیونکہ گھر میں کوئی عورت اور اُس کے متعلق کھانے کا خرچ نہ تھا۔ اب خط اور لڑکوں کے بڑھ جانے کے سبب سے سہ گونہ خرچ بڑھ گیا اور آمدنی میں کوئی اضافہ نہ ہوا، اتنے کثیر انگریز ملاقاتیوں میں میں نے تین انسان دوست انگریز دیکھے۔ ایک سرکاری والے جو اس وقت وائسرائے کے پرائیوٹ سکریٹری تھے بغیر میری استدعا کے انہوں نے یہ تجویز کی کہ سرشتہ سفارت ایراق میں بھیجا جائے اور علاوہ اخراجات کے ایک ہزار ماہانہ پاؤں، صاحب ممدوح نے کوشش کی حد کر دی آخر منظور کروا لیا مگر یہ لڑکا عین وقت پر اس شدت سے

بیمار ہوا اور بیماری نے تین مہینے طول کھینچا اور یہ بھی امر تھا کہ بقدر ضرورت آمدنی تھی عذرات لاطایل کر کے نہ گیا۔ دوسرے بوڈلن صاحب جو پہلے کمشنر پٹنہ اور بعد کو فٹنٹ گورنر بنگال ہوئے۔ جس زمانہ میں کلکتہ میں پہلی نمائش ہوئی یہ کمشنر تھے مجھ پر اصرار کیا کہ تم حضور نظام کی تعریف میں قصیدہ کہو وہ اس نمائش میں کلکتہ آئیں گے اور بوڈلن صاحب ریڈیٹ بھی آئیں گے مجھ سے ربط بہت ہے میں سعی کروں گا میں نے حسب ممکن ان کے پندرہ شعر خیر مقدم کے کہہ کر محل پر نہایت خوب خط میں زردوزی اور کچے نگینوں اور موتیوں سے حرفوں اور حاشیوں کو مزین کیا غائبانہ ۱۰ سو روپے اس میں خرچ ہو گئے۔ جس انگریز نے دیکھا نہایت پسند کیا، خود بوڈلن صاحب مجھ کو لے کر کلکتہ گئے اور بوڈلن سے سفارش کی چونکہ باتیں انگریزی میں ہوتی تھیں میں نے کچھ نہ سمجھا مگر دونوں سید غصہ میں تقریر کرتے تھے اتنا معلوم ہوا کہ بوڈلن نے منظور نہ کیا بوڈلن صاحب رنجیدہ ہو کر واپس لائے پھر حیف سکرٹری کے پاس لے گئے تاکہ ان کے ذریعہ سے پیش کریں انھوں نے وعدہ کیا کہ پرسوں اپنے ہمراہ لیجا کر خود میں حضور نظام کی خدمت میں پیش کروں گا اتفاق حضور نظام کچھ علیل ہو گئے اور پھر فوراً ہی روانہ ہو گئے میں منہ دیکھ کر رہ گیا سخت اور روپے ضایع ہوئے۔ قیصر صادق دوست اولڈ ہم صاحب کمشنر پٹنہ تھے خود بخود ایک دن مجھ سے ملنے کو آئے کئی کمرے سخت بارش میں ٹوٹ گئے تھے دیکھ کر مجھ سے کہا کہ فوڈ موریل دیکھئے اور اپنے حالات درج کیجئے چنانچہ موریل لیکر گورنمنٹ میں ایسا رپورٹ کیا کہ شائد ہی کسی انگریز نے کسی ہندوستانی کے لئے کیا ہو اور مجھ سے کہا کہ میں نے مرمت مکان کے لئے چار ہزار اور کتابوں کے چھپنے کے لئے پانچ ہزار اور چار سو روپے مانا نہ پنشن تین پشتوں کے لئے رپورٹ میں گورنمنٹ سے استدعا کی ہے اگر میں چھ مہینے اور رہ گیا تو ضرور اپنے رپورٹ کو منظور کراؤں گا۔ تقدیر دیکھئے کہ ان کی ماں کا اصرار ہوا کہ یورپ چلو بلکہ دو دن تک کھانا چھوڑ دیا مجبور ہو کر وہ راضی ہوئے اس زمانہ میں ہمارے افتخار روزگار اور دل سوز عزیز بہار کونسل کے ممبر تھے وہ فرماتے ہیں کہ بنگال میں ہندو مت میں کسی سے باتیں کر رہا تھا پشت کی طرف سے اولڈ ہم صاحب نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا جب میں نے صاحب سلامت کی تو کہنے لگے کہ علی امام میں علی محمد شاد کو تمھارے سپرد کرتا ہوں، افسوس میں جاتا ہوں وغیرہ وغیرہ۔ ان کے جانے کے بعد نتیجہ یہ ہوا کہ مرمت کے لئے ایک ہزار کتابوں کے لئے نو سو روپے اور فقط میری زندگی تک ایک ہزار سالانہ پنشن مقرر ہوئی میں نے واپس کرنے کا قصد کیا تھا کیونکہ اتنے قلیل میں تو ملازموں کی تنخواہ ٹھک ادا ہونا مشکل ہے مگر عزیز خدشہ سرسید علی امام صاحب کے روکنے سے مجبور ہو کر قبول کر لیا حالانکہ میری نانی نواب سراج الدولہ شہید فرزند اسے بنگال و بہار کی حقیقی نواسی کی بیٹی اور نواب اسماعیل قلی خاں صوبہ دار بھاگل پور و مولگیر حقیقی بچھو بھی زاد بھائی نواب سراج الدولہ کے میری نانی کے پردادا تھے غدر ۱۹۴۷ء میں میری نانی مر گئیں میری ماں کو سب نے ڈرا ہوا کہ سراج الدولہ سے انگریز سخت ناراض ہیں درخواست نہ دو وہ ڈر گئیں، پنشن اس خاندان کی پانچ ہزار مانا نہ ہو کر ایک ہزار مانا رہ گئی تھی۔ میں نے اپنے موریل میں اس کا ذکر کیا اور کمشنر پٹنہ نے پرانے کاغذات سے تصدیق بھی کی مگر شاید اصل کا خیال سے میری پنشن کو لٹری قرار دیدیا۔ اب بھی میرے اکثر احباب مجھ کو ابھارتے ہیں کہ موقع ہے پھر موریل دو تاکہ تمھاری دو تین پشتوں تک مقرر ہو جائے مگر اب میرا جی چھوٹ گیا، میں نے اپنی سوانح عمری تین جزیو میں لکھ کر اپنے ایک قابل شاگرد کو سپرد کر دی ہے اور وصیت کر دی ہے کہ میرے مرنے کے بعد ضرور چھپوا کر عبرت کے لئے مشترک کرنا خدا کرے آپ زندہ رہیں اور یہ کتاب آپ کے اور میرے مشہور روزگار بھائی رائٹ آنریبل سٹریسید امیر علی صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ کی نظر سے گزرے موصوف الیہ میرے بہنوئی مولوی سید وارث علی مرحوم کے چھوٹے بھائی اور مجھ پر بہت مہربان تھے۔ مجھ کو اپنے چھوٹے چھوٹے باقاعیم یافتہ بچوں کا خیالی مارے ڈالتا ہے کہ غنقریب یہ کس میں ہونے والے ہیں کیونکہ اگر کہاں سے ان کی تعلیم ہوگی۔ میرا خاندان جو دادا کی طرف سے صمصام الدولہ خاں دراز خاں (جو نادر شاہ کی فوج کے ہاتھ سے کینال میں لڑ کر مارے گئے) اور دادا کی طرف سے قطب الملک سید عبداللہ خاں بارہہ، نانا کی طرف سے لطف اللہ خاں صادق پانی پتی نانی کی طرف سے بھی علی وردی خاں مہابت جنگ تک منتہی ہوتا ہے اور حقیقت یوں ہے کہ اب بجز میرے ان چاروں خاندانوں کے کوئی یادگار نہیں ہے یا میرا حقیقی بھانجا سید نصیر حسین خیال باقی ہے۔ اگر یہ بچے حالت موجودہ پر رہ گئے تو یہ چاروں خاندان پٹنہ میں مٹ جائیں گے۔ میں جب جیتا تھا تو یہ بچے نہ تھے نہ امید تھی ورنہ کوشش سے باز نہ رہتا عمر تو تکمیل میں کافی اور اس بڑھاپے میں خدائے پوتا پوتی (جو از حد نیک و ذہین ہیں) عطا کئے لامحالہ برخلان وضع کوشش بھی کی مگر اب تک تو کوئی صورت نہ نکلی۔

میں عنقریب دو نظم درخواستیں ایک فریم میں لگا کر حضور پر نور بادشاہ مالک دکن میں گزرائے کی غرض سے اپنے افتخار روزگار عزیز سر سید علی امام صاحب خدمت میں بھیجے گا قصد کرتا ہوں ایک تو خود اپنی طرف سے ہے یہ اردو میں ہے دوسری فارسی میں فارسی زبان کی طرف سے ہے مگر مجھ کو یہ معلوم نہیں ہے کہ یہ قصد میرا اپنی جگہ ٹھیک ہے یا نہیں خیال کرتا ہوں کہ اگر موقع پیش کرنے کا جناب مدد فرما کر کوہ کا تو داخل دفتر فرمادیں گے۔

میرے آقائے محترم اس عریضہ میں میرے دل نے بے اختیار اصرار کیا کہ اپنے قصاصت کی نہایت مختصر فہرست و مختصر حالت لکھ کر جناب والا کے حضور میں بھیج دوں اگرچہ یہ لحاظ اس ناچیز محض کے شرم آتی ہے کہ جناب کو ایسی عظیم الفہرست و کبر سن میں ایسے ایسے دفتر طویل کے پڑھنے کی طرف متوجہ کروں مگر جناب خود خیال فرما سکتے ہیں کہ ہر حیثیت میں جناب کے مثل کون ہے اور اس ناچیز ریاضت کی سمجھ کو کبھی دلا دے سکے، ولولہ تو مجھ کو کرتا ہے کہ یہ سب ناچیز مکمل و مرتب آپ کی خدمت میں پیش کر دوں لیکن افسوس کیا کروں ناچار مختصر فہرست ہی پر قناعت کرتا ہوں، میرے مخدوم اگرچہ اوقات ضائع ہو گئی لیکن جب تک کسی چیز کو مکمل نہ دیکھے کیا حکم لگا سکتا ہے با ایں ہمہ بھی ضرور تھوڑا تھوڑا کر کے ملاحظہ فرمائیے۔

میرے غزلیات کا دیوان چالیس جزیروں میں ہے انشاء اللہ اس کے بارہ میں مع چند غزلوں کے عرض کروں گا۔ افسوس ہے کہ عالم پیری زیادہ لکھنے نہیں دیتا ورنہ بہت سی باتیں آپ کی خدمت میں عرض کرنی تھیں خیر اگر زندگی باقی ہے تو آئندہ۔ میرے محترم سید آپ نے دس بارہ برس ادھر اپنے سفر از نامہ میں ایک شعر سبع معلقہ کا لکھا تھا: "دیارِ حلت بہا تمیمتی الخ" جس سے امید ہوئی تھی کہ غالباً عظیم آباد میں موقع پا کر آپ قدم رنجہ فرمائیں گے لیکن افسوس اب تک تو یہ موقع نہ ہوا خدا جانے اس زندگی میری لاپٹ بھری مایوس آنکھیں زیارت سے بہرہ ور ہوتی ہیں یا نہیں عمر کم طویل و عدد کم ذلیل۔

پٹنہ عظیم آباد - ۲۱ اپریل ۱۹۵۵ء - سید علی محمد شاد

ثنوی مادر ہند غالباً ایک ہزار شعر سے اس میں زیادہ ہیں

بنگالیوں نے جس زمانہ میں ہندو ماترم منظوم کر کے شایع کرنا شروع کیا اور حد اعتدال سے گزر گئے تو حقیر کو خیال پیدا ہوا کہ میں بھی ایک نظم لکھوں، چنانچہ وہ پوری ثنوی ہو گئی، خلاصہ مضمون یہ ہے۔ ابتدا میں سر زمین ہندوستان کا سچا جغرافیہ منظوم کر کے یوں کہا ہے

اک محتشمہ وہاں کی ساکن	اس مادر دہر کی تنہی ہم سن
آدم سے ملی تھی وہ خوش اوقات	خواسے بھی کھر چکی ملاقات
ہم خواہے پیر آسمان تھی	اس پر بھی قوی تن و جواں تھی
ہم رتبہ نوح اک یہی تھی	طوفان سے زبرہ بچ رہی تھی

اور اور اوصاف کے بعد

دو لخت جگر تھے اُس کے قابل	دونوں کو علوم و فضل حاصل
اک لخت جگر کا رام تھا نام	خوش خوتا بہت وہ نیک انجام
دلہند دوم جو نامور تھا	نام اُس کا رحیم مشہر تھا
ہر طرح سے دونوں من چلے تھے	آغوش نشاط میں بے تھے

پھر ان دونوں بیٹوں کے سچے اوصاف مذکور کر کے یہ بیان کیا ہے کہ وہ محتشمہ پہلے تو اپنی اس سرکار کا انتظام رام بڑے بیٹے کے حوالہ کر کے مطمئن زندگی بسر کرتی تھی۔ رام نے (تاریخی حیثیت سے) جس طرح یہاں کا نظم و نسق کیا اس کو بیان کر کے آخر عہد میں جو نقص اس نظم میں ہوتے گئے اُس کو منظوم کیا ہے مادر ہند نے گھر گھر پھر نظم ملکیت اپنے پھوٹے بیٹے رحیم کے سپرد کیا ابتدا میں تو رام رحیم دونوں کے آپس میں چشمک و نزاع رہی لیکن آخر دونوں باہم ہو کر انتظام کرنے لگے۔ اُس وقت سر زمین ہند کی حالت یہ تھی

اس ملک کا مال و دولت و زر
اس ملک کو مال دار پا کر
کالے کوسوں سے آکے تیار
پچیس کی جنس بے تک و دو
پھل پھول کا جنگلوں کی کیا مول
جاتا نہ کہیں یہاں سے باہر
آتے تھے جتھے ہٹا بنا کر
اجناس خریدتے تھے ناچار
لے جاتے تھے لوگ دیکے لولو
بک جاتے تھے وہ بھی سونے کی تول

رحیم کے نظم و نسق کی خواہشیں پھر آرم و رحیم کے آپس کا نفاق خانہ برانداز، مادر گرامی کی پریشانی اس کی حالت پھر صورت حال دکھا کر اپنے دونوں بیٹوں کو سمجھانا۔ اس کے بہت سے شعر منظوم کئے ہیں، بعض یہ ہیں:

آپس ہی میں لڑکے زور کھوئے
زر بھی نہیں مال بھی نہیں پاس
اب کے جو وعدہ کرے چڑھائی
اغیار کی قید میں مرو گے
تھے چند بچے بچائے زیور
اچھے رہے تم تو دونوں لڑکر
مال صدقے دلوں میں کیا سمائی
ہولوں سے ضعیف و مضحل ہے
تصویر الم ہوں سر سے تا پا
سیکھے کوئی تم سے لکر اور فن
جس مال نے کہ پیٹ سے نکالا
جس مال نے کہ بھلے برے دن
جس مال نے کہ بھی نہ کچھ کیا چین
راحت کسی طرح آئے تم کو
رکھا تمہیں ہر گھڑی نظر میں
اس مال کا خیال تک نہ آیا
پیارو مری آس توڑ بیٹھے
دم آپ لبوں پہ آ رہا ہے
گر مرگئی غم کی یہ ستائی

غرض مادر ہند نے بارہا بیٹوں کو موثر طریقہ سے سمجھایا مگر دونوں بیٹوں کو ہوش نہ آیا نتیجہ یہ کہ سہ

حرمت کا نام کی دھیان لئے
اس مردہ صفت کو پا کے بیکس
کوہ لگے کایں کایں کرنے
کتے کئی تاک میں کھڑے تھے
رستہ میں اٹھا کے پھینک آئے
منڈلانے لگے ہوا پہ کر گس
اس لاش پہ گدے لگے اترنے
دو چار شغال آپڑے تھے

اک اُن میں تھا بے وفا پر از برق ایسے پہ نہ کس طرح گرے برق (میرن)
جو پالے اُسی کو مار چھوڑے جس ظن میں کھائے اُس کو توڑے

(خاندان علی وردی خاں اسی میر جعفر و میرن نے تباہ کیا)

کب راز سے ہے یہ بات خالی رکتی نہیں بات ہونے والی
تاجر کئی اہل علم با ہوشش تھا اُلفت قوم کا جنھیں جوش
تھے اپنے وطن پہ دل سے عاشق تقدیر بھی اُن کے تھی موافق
دیتے تھے وہ اپنی قوم پر جاں آئے تھے اسی کی دھن میں وہ یہاں
شاید کہ نصیب مال و زر ہو کچھ اور بھی قوم بہرہ ور ہو
اس درجہ تھی ہمت اُن کی عالی بن جاتے تھے بیکسوں کے والی
تھا ڈاکٹر ایک اُن میں خوش ذات لاکھوں ہی پہ جس نے ماردی لات
قبضہ میں خزانہ آ رہا تھا انعام علاج پا رہا تھا
خود مطلبیوں سے بسکہ تھا عار لینے سے کیا پر اُس نے انکار
قوم اُس پہ کرے نہ کیوں مباہات ہڑھوا لے اپنے اختیارات
الحق یہ عطیہ خدا ہے یہ نفس کشی نہیں تو کیا ہے
القصہ وہ تاجر ان خوش حال آگاہ تھی جن کے حال سے زال
وہ خود تھے عبوز کے ہوا خواہ گزرے اسی راستہ سے ناگاہ
دیکھا کہ پڑی ہے ایک میت اعضا ہیں تمام اُس کے ساکت
چلتے پانی جو سانس کم کم سمجھے کہ ابھی ہے اس میں کچھ دم
چہرہ سے ہٹائی جس گھڑی خاک پہچان گئے وہ اہل ادراک

غرض کہ مادر ہند کو خاک سے اٹھایا دلا سا تشفی دیکر کہا ہے

کچھ یاد ہے اے ضعیف و مضطر آتے تھے ہم اتفاق پر گھر
بیٹوں کو تمھارے ہم سے تھا شک جانے نہیں دیتے آستان تک
کچھ یاد ہے تم کو وہ زمانہ تھا ہم کو محال گھر بنانا
تم نے کئی پر گئے دئے تھے ہو پرورش اپنی اس لئے تھے
بیٹوں نے مگر نہ دی اجازت ہم چھین کے لیں نہ تھی یہ طاقت
انساں کا ہے درد مند انسان ہم رہنے نہ دیں گے یوں پریشاں

غرض اس وقت کے تمام واقعات اور معاہدے یہاں ایک خاص پیرایہ سے مذکور کئے ہیں پھر راقم و رحیم کا یہ دیکھ کر ہر ہم ہونا آخر مجبور ہو جانا اور بحالتِ مجبوری اپنی ماں کو اس گروہ کے عوالہ کرنا بیٹوں کی سفارش کرنا وغیرہ وغیرہ پھر مادر ہند کا اس گروہ کے ہاتھ میں جانا، اقرار و معاہدات کا مختصر بیان آخر میں جوہلی کے دربار میں مادر ہند کا اپنے بیٹوں کو لیکر حاضر ہونا، دربار کی کیفیت مادر ہند کا عرض حال میں کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھنا، شہنشاہ کا جواب اور شنوئی کا خاتمہ، افسوس ہے کہ مجھ کو شعر یا د نہیں ہیں اور شنوئی ڈھونڈ کر نقل کرنا دشوار ہے۔ پہلی دفعہ یہ شنوئی عالی جناب سر سید علی امام صاحب کی کوٹھی کلکتہ میں جبکہ مومی الیہ لامبر تھے ایک مجمع میں جہاں لائق لائق ہنگالی بھی تھے پڑھی گئی

جس قدر اثر ہوا میں خود کیا بیان کر دوں پھر یہ شوق تمام پٹنہ اور سمبھاگپور میں نہایت اصرار سے پڑھوائی گئی، تعریفوں کی بوچھاڑ ہوئی اکثر لوگ رونے لگے اور نہایت شد و مد سے یہ قرار دیا گیا کہ میری ناچیز کل تصنیفوں کے چھاپنے کے لئے ایک سو ساٹھ قائم ہو چند روز تک بڑا دلولہ رہا آخر ایک کو بھی متوجہ نہ پایا، یہ حالت ہے میرے ملک کے قدر شناسوں کی۔

وہ سات کتابیں نصاب تعلیم اردو و فارسی و عربی کی جن کو حقیر نے جناب سر کنزیری والس صاحب مستشرق مشہور کی ہدایت سے تین برس کی سخت محنت میں تصنیف کیا جن کے پڑھنے سے چار برس کے اندر متعلم نہایت سہولت سے ان تینوں زبانوں میں کافی استعداد پیدا کر کے دوسری کتابوں سے بے نیاز ہو جائے گا۔

انہیں کتابوں کی تصنیف میں غرق رہنے کی بدولت مصنف کو فاضل پاکر دیوان قدیم جس کے سپرد زمینداری وغیرہ تھی قریب پچاس ہزار روپوں کے غبن کر گیا دو موضع نیلام ہو گئے، مقدمہ کے دوران میں اپنے جرم کو قبول کر کے اور سچی حالت لکھ کر دریا میں ڈوب گیا۔ منجملہ تصنیف کی صلہ یا پی کے ایک یہ بھی صلہ ہی ہے جو حاصل ہوا۔

۱۔ مذکورہ بالا کتابوں میں پہلی کتاب اردو تعلیم ہے حضور علامہ روزگار نواب عماد الملک بہادر بالقابہ کو شاید یاد ہوگا کہ صوبہ بہار میں جب ڈاکٹر فیلن مصنف ڈکنزری انسپکٹر تعلیم اور سوہن لال (سخت متعصب ہندو ساکن میرٹھ) اسٹنٹ تھا موقع پاکر اس نے برخلاف اردو و پنجاب فارسی کے ایک محمودیل طہار کر کے ڈاکٹر فیلن کے ذریعہ سے سر چارڈ ٹمپل لفٹنٹ گورنر بنگال کی خدمت میں پیش کیا اس کے اعتراضوں کے جواب صوبہ بہار کے موبدین اردو نہ دے سکے آخر اردو کے حروف اٹھا کر ہندی و ناگری حروف جاری ہو گئے۔ منجملہ اعتراضات کے یہ اعتراض تھے۔

۲۔ اردو لکھنا بہت مدت میں آتا ہے برخلاف ہندی و ناگری کے
۳۔ اردو حرفوں میں صلاحیت جعل بنانے کی بیکر ہے ذرا سے تغیر میں کچھ کے کچھ معنی ہو جاتے ہیں اسی بدولت مقدمہ بازی میں فلاں فلاں خاندان تباہ ہو گئے۔

۴۔ عام خلقت اردو میں لکھتی پڑھتی نہیں ہے۔

۵۔ شوشہ دار حرفوں کے لئے کوئی قاعدہ منضبط نہیں ہے صرف عادت سے لوگ پڑھتے ہیں۔

۶۔ مفرد الفاظ جب تک دوسری عبارت سے ملائے نہ جائیں صحیح نہیں پڑھ جاسکتے اور حرکات ثنائیہ زیر زمینیش سے بھی کام نہیں چلتا (مثلاً دود) بحالت مفرد خواہ وال پر پیش دے کر بھی کام نہیں دے سکتا ہے۔

۷۔ علامات قرأت الائی اس میں مطلق نہیں جملہ صحیح آواز سے آوا نہیں کیا جاسکتا وغیرہ وغیرہ۔

حقیر نے اس پہلی کتاب میں جملہ اعتراضات مذکورہ بالا کا نہایت سہولت سے تدارک کر کے جا بجا ایسے قواعد سے کام لیا کہ بچے خواہ وہ لوگ جو اس زبان کو مطلق نہیں جانتے ہیں بہت جلد آسانی سے مفرد خواہ مرکب الفاظ کو صحیح آواز سے پڑھ لیں نہ فقط نئے لکھنے پڑھنے والے بلکہ پرانے لکھنے پڑھنے والے بھی صرف ایک دفعہ واقفیت حاصل کر کے لکھنے پڑھنے لگیں مولوی صاحبوں کے بچہ اصرار سے تین سو جلدیں اس کی چھپوادی تھیں پانچ چھ دنوں میں سب تقسیم کر دیں بلا مبالغہ کل ایک ہفتے میں بچے حرف شناس ہو کر مختصر عبارت لکھ پڑھ لیتے ہیں اور چار ہفتے میں کتاب پوری ہو کر دوسری اردو کی کتابوں سے بے نیاز کر دیتی ہے شاید کہیں مل جائے تو ایک جلد ملاحظہ کے لئے حاضر کر دوں گا۔ بیورج صاحب حج اس کے بارہ میں لکھتے کہ میری میز پر یہ کتاب پندرہ دن رہی میں نے اس کے ذریعہ سے کل پندرہ دن میں ایک پوری دستاویز پڑھ لی۔ کسی زبان میں ایسی پہلی کتاب نہ ہوگی وغیرہ۔

فارسی تعلیم

نصاب کی یہ دوسری کتاب فارسی سکھانے کی ہے کل دس جہینے میں یہ کتاب پہلے تو باقاعدہ فارسی سکھا دیتی ہے اسی مدت میں لڑکے کی اتنی استعداد ضرور ہو جاتی ہے کہ فارسی کی ہر قسم کی عبارت کو نظم ہو یا نثر درست پڑھ کر معنی بتا دے گا۔ جہاں تک استقرار کیا ہے فارسی زبان کے مشہور اگلے تصانیف سات قسم کی عبارت پر منقسم ہیں لڑکا ہر قسم کی عبارت پڑھ کر معنی سمجھ لے گا اور عجیب نہیں کہ خود بھی مختصر طور سے ساتوں قسم کی عبارت لکھ دے۔ اس

کتاب میں ایک بات یہ بھی نئی ہے کہ نئے نئے اصطلاحات جو زمانہ حال میں اختراع کئے گئے ہیں اور اہل زبان استعمال کرتے ہیں اس کا فرہنگ بنا دیا ہے اس وجہ سے لوگوں کا سفر نامہ مرحوم ناصر الدین شاہ اور سیاحت نامہ مرزا ابراہیم بیگ کو بخوبی پڑھ کر سمجھ لے گا کہ یہ کتاب مرتب ہے مگر چھپی نہیں۔

الصرف

اسی طرح صرف عربی و نحو عربی و منطق و ادب عربی میں چار کتابیں بحالت مسودہ بے ترتیب پڑی ہیں جن کے بارہ میں بغیر ترتیب دے کر کچھ عرض نہیں کر سکتا مگر بادی النظر میں یہ ہے کہ ڈیڑھ برس میں متعلم اردو اور فارسی باقاعدہ حاصل کرے گا اور عربی کے لئے تین برس کافی ہوں گے۔

تاریخ صوبہ بہار

ساتھ برس ادھر بھی جب پرنس آف ویلز ہندوستان آکر ٹیپے میں بھی آنے والے تھے تو ایک کمیٹی میں نواب ولایت علی خاں مرحوم اور صاحب کمشنر کے ایما سے حقیر نے اس کے لکھنے کا وعدہ کیا اور لکھی بھی مگر کچھ ایسا دباؤ ڈالا گیا کہ آخر یہ کتاب لغو و مہمل رہ گئی آخر ان بزرگوں کے بعد پھر مسودہ کرنا شروع کیا اب تخمیناً پچاس جزو تک اس کا مسودہ ہو چکا ہے۔

کتاب مردمان دیدہ

بدوشاہ سے میری عادت تھی کہ جن بزرگوں اور دوستوں سے نیاز حاصل ہوتا گیا ان کی مختصر حالت و صفات کو قلم بند کرتا آیا، قریب سات سو بزرگوں کے حالات اس میں درج ہیں باقاعدہ تفاوت عمر یعنی ساتھ برس کی عمر والے اور اسی نوے برس کے سن رسیدہ تک کے جزئیات حسن معاشرت، طرز لباس و آداب محبت، پوشاک، حالت و غیرہ کو مفصل ضبط کر دیا ہے، یہ کتاب بہت حجم ہو گئی تھی، مجھ کم بخت کی غفلت سے ایک لڑکے نے بعض مقامات ایسے چیر ڈالے کہ بعد کو تدارک کرنا دشوار ہو گیا۔

کتاب فکر و بلوغ

در اصل اس کتاب میں نقطہ میر تقی کے حالات (جہاں تک واقف کار بزرگوں اور خود ان بزرگوں سے معلوم ہوئے یا چشم دید ہیں) لکھنے تھے۔ خیالی گزرا کہ مرزا دبیر بلکہ فضیح دلیگیر خلیق، ضمیر تک کے حالات درج کئے جائیں کیونکہ میرا خیال ہے کہ شاید ہی کسی کو اتنے حالات معلوم ہوں علاوہ اس کے سب کے کلام اور سب پر ریویو بھی ہو پڑتے پڑتے بہت بڑی کتاب ہو گئی لامحالہ ایک مقدمہ چھ سات جزو کا اردو زبان اور حقیقت شعریہ پر بڑھانا پڑا تاکہ میں خود موازنہ نہ کروں بلکہ مقدمہ کو پیش نظر رکھ کر ناظرین موازنہ کریں۔

یومیہ فی عقاید امامیہ

یہ بیان عقاید مذہب شیعہ میں ایک رسالہ ہے بہ زبان عربی صرف دونوں میں عربی مذہبی کلاس شیعہ کے لئے لکھا تھا غیر مذہب والے بھی تاکہ ملاحظہ کریں اور ناراض نہ ہوں۔

فلسفہ مذہب

مولوی سید مقبول احمد صاحب کی وہ ہنگامہ خیز تصنیف جس نے علماء اسلام کی "کافر ساز" مجالس میں پھل ڈال دی تھی اس میں مذہب کی ابتداء و ضرورت، مذہب قومیت، قومیت و الہیات، مذہب و نبوت، مذہب و تکوین، مذہب و معاد، مذہب و تفسیر، مذہب و اخلاق، مذہب و عبادات اور انجام مذہب پر شاہیت محققانہ و عالمانہ بحث کی گئی ہے۔ قیمت دو روپیہ۔ - منیجر نگار

گلہائے جعفری

یعنی

جناب اشرف لکھنوی کے ڈیڑھ سو اشعار

جو اڈیٹر نگار نے اپنے تعارفی مقدمہ کے ساتھ بہت اہتمام سے شائع کئے تھے ان کی چند جلدیں اتفاق سے رہ گئی ہیں۔ ہر کے ٹکٹ سے پر انتخاب ذریعہ پورٹ لے سکتا ہے۔ - منیجر نگار لکھنؤ

کچھ گنجے فرشتے کے بارے میں

منٹو کے افسانوں پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ خود ان کی شخصیت پر بھی کئی مضامین نکل چکے ہیں۔ لیکن اس تک ان کی شخصیت نگاری کی طرف توجہ کی گئی جو حالانکہ ان کے افسانوں کے بعد ان کی جو چیز سب سے زیادہ مقبول ہوئی وہ وہی قلمی مرقعے ہیں جو ”گنجے فرشتے“ کے نام سے کتابی صورت میں دوبار شائع ہو چکے ہیں۔ اس مجموعے کے لئے میں نے ”مقبول کی صفت استعمال کی ہے۔ اس سے میرا مطلب یہ نہیں کہ یہ مجموعہ اپنی مقبولیت کی بنا پر لائق التفات ہے۔ مقبول تو میرے درجے کی تصانیف بھی ہوتی ہیں اور وہ بھی جن کا سرے سے کوئی درجہ نہیں ہوتا۔ دراصل میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ منٹو کی طبعی نے اردو ادب کو جو کچھ دیا ہے اس میں ان کے افسانوں کے بعد میرے نزدیک ان کے قلمی مرقعے سب سے زیادہ اہم ہیں۔

کسی افسانہ نگار کا شخصیت نگار ایسی بات ہے جس کے سمجھنے میں نہ دقت ہو سکتی ہے اور نہ حیرت۔ لیکن اگر میں یہ کہوں کہ افسانہ نگاری اور شخصیت نگاری کے فن ایک دوسرے سے بہت مختلف ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے بہت مشابہ ہیں تو ممکن ہے بہت سے لوگ چونک پڑیں۔ خصوصاً وہ لوگ جو قلمی مرقعوں کو زندگی کی شان میں قصیدہ اور مرنے والوں کی یاد میں مراثی سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ افسانہ نگاری کی طرح شخصیت نگاری کا فن قصیدہ اور مراثی دونوں سے نہ صرف علحدہ ہے بلکہ بلند بھی۔ افسانہ نگار اور شخصیت نگار دونوں کا کام انسانی کردار کا تجزیہ پیش کرنا ہے۔ ایسا تجزیہ جو انسانی زندگی سے متعلق لطیف و معنی خیز تجربات میں اضافہ کرے۔

ہندوستان و پاکستان جیسے ممالک افسانہ نگار کے لئے جس قدر مواد ہم پہنچاتے ہیں اسی قدر مرقع نگار کے لئے مشکلات ہیں۔ یہ کل کی بات نہیں بلکہ آج بھی یہ حال ہے کہ ہماری شرافت مندوں کی لغزشوں سے چشم پوشی کا تقاضا کرتی ہے اور ہماری شائستگی مرنے والوں کی کمزوریوں کے ذکر میں مانع آتی ہے۔ یہ تقاضا اور یہ ممانعت عام آدمیوں تک محدود ہو تو خیر لیکن جس ملک میں رشید احمد صدیقی جیسا ادیب جو خود ایک اعلیٰ درجے کا مرقع نگار ہے عصمت چغتائی کے ”دوزخ“ جیسے مضمون کو پسند کر سکے وہاں کے مرقع نگاروں کی دشواریوں کا کیا پوچھنا۔

واقعہ یہ ہے کہ ہمارے ملک کا اخلاقی ماحول اور تہذیبی رکھ رکھاؤ سیرت نگاری اور مرقع نگاری کے فن کے بالکل منافی ہیں۔ بیسویں صدی کے وسط میں سانس لینے کے باوجود ہم اتنا بھی سننے کی تاب نہیں رکھتے کہ فلاں بڑی شخصیت کو فلاں حسین شخصیت سے محبت تھی۔ جب عشق و محبت جیسے جذبات کی طرف یہ رویہ ہو تو ظاہر ہے کہ کسی کی کمزوریوں اور بے راہ رویوں کا ذکر کہاں تک گوارا ہوگا۔ شیلے ایک مرتبہ کسی مخصوص ذہنی کیفیت کے زیر اثر اپنے اس کمرے سے بالکل برہنہ گزر گیا جس میں اس کی ایک خاتون دوست اور اس کی بیوی کھانے پر اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ دروازہ کھلنے پر ایک فرانسیسی لڑکی سے عشق کیا جس سے ایک ناجائز اولاد پیدا ہوئی۔ مغربی مصنفین شیلی اور ڈورڈور تھ پرنا نہ کرنے کے باوجود ان باتوں کو دبانے اور چھپانے کی کوشش نہیں کرتے۔ ان کے قارئین کو ان باتوں پر گھبرانے اور بوکھلانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن اگر ہمارے یہاں کوئی سیرت نگار یا مرقع نگار کسی شخص کی سیرت، شخصیت اور اخلاق و طبیعت کے کسی پہلو کو اجاگر کرنے کے لئے اس قسم کی باتیں لکھ دے تو وہ راہ چلتے سنگسار کر دیا جائے۔ یہ محض میرا اندیشہ نہیں۔ خود منٹو کے ساتھ ایک ذرا ہندوستانہ طور پر یہی سلوک کیا گیا۔ یعنی انھیں واقعی سڑکوں کے بیچ سنگسار تو نہیں کیا گیا لیکن خطوں اور رسالوں میں سرنش ضرور کی گئی۔ اس سرنش کی روداد آپ خود ”گنجے فرشتے“ کے آخر میں پڑھ لیں گے۔ میں تفصیل میں اس لئے نہیں جانا چاہتا کہ اس سے مضمون میں غیر ضروری طوالت کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔

ہاں تو میں جلد سے جلد یہ کہنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ”گئے فرشتے“ میں جو مضامین ہیں انھیں لکھتے وقت منٹو نے نہ تو اپنے ملک کے اس اخلاقی ماحول اور تہذیبی رکھ رکھاؤ کا احترام کیا جو مرقع نگاری کے فن کے منافی ہے اور نہ اس مرامت کی پروا کی جس سے ان مرقعوں کے پڑھنے والوں کے ہاتھوں انھیں دو چار ہونا پڑا۔ بقول منٹو ”اس کتاب میں جو فرشتہ بھی آیا ہے اس کا مونڈن ہوا ہے اور یہ رسم میں نے بڑے سلیقہ سے ادا کی ہے۔“ لیکن اس جملے کی بنا پر یہ رائے قائم کرنا درست نہ ہوگا کہ جس طرح اردو غزل میں نامرادی کی رسم تیسرے چلی تھی اسی طرح اردو مرقع نگاری میں مونڈن کی رسم منٹو سے چلی ”گئے فرشتے“ کے مضامین اپنی نوعیت کے اعتبار سے اس روایت کا تسلسل ہیں جو عصمت چغتائی کے مضمون ”دو زخی“ پر مبنی ہے۔ نہیں۔ میں غلط کہہ رہا ہوں۔ دراصل منٹو کے یہ مرقع اگر کسی روایت کا تسلسل ہیں تو اس روایت کے بانی مرزا فرحت اللہ بیگ ہیں جن کے دو مضامین ”تذیر احمد“ اور ”ایک وصیت کی تعمیل“ نے اردو مرقع نگاری میں ایک نئے طرز کی طرح ڈال دی۔ ایک ایسا طرز جس کی سب سے اہم خصوصیت حقیقت کی جرأت مندانہ تلاش اور بے باکانہ ترجمانی ہے۔ عصمت کا ”دو زخی“ بھی اسی سلسلہ کی چیز ہے۔ یوں تو ان میں سے ہر ایک کی مرقع نگاری امتیازی خصوصیات کی حامل ہے لیکن ایک بات تینوں میں مشترک ہے۔ وہ یہ کہ ان تینوں کے یہاں محبوب، محترم اور محسن شخصیتوں کی مصوری میں بھی صداقت اور دیانت کا رشتہ ہاتھ سے جانے نہیں پاتا۔ ان تینوں میں سے کسی کے یہاں اپنے دوستوں اور بزرگوں کی کمزوریوں سے خاموش گزر جانے کی کوشش نہیں ملتی۔

مٹھایا جیسا ہے اسے ویسا ہی پیش کر دیتے ہیں۔۔۔ مرقع نگار سے مرقع نگاری کے فن کا سب سے پہلا مطالبہ یہی ہوتا ہے کہ وہ زیر مطالعہ شخصیت کو اس کی قدتوں اور کمزوریوں، خوبیوں اور خامیوں، لطافتوں اور کثافتوں کے ساتھ لفظوں میں اسیر کر لے۔

اردو مرقع نگاروں میں دو نام اور بھی قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر عبدالحق اور رشید احمد صدیقی۔ یہ دونوں انسانی فضائل کے پرستار ہیں اسی لئے ان کے موضوع انسان سے زیادہ انسانی فضائل کے مجسمے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کے مرقعے جاندار بھی ہیں اور جانفزا بھی۔ دلکش بھی ہیں اور دلکشنا بھی۔ وہ (مرقعے) قارئین کو اپنا راز دار بنائے بغیر ان کے رفیق بن جاتے ہیں۔ ان پر اعتماد نہ کرنے کے باوجود اپنا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ ان سے میری آپ کی ملاقات ہمیشہ جلو تلوں میں ہوتی ہے۔ خلوتوں میں کبھی نہیں شاید اس لئے کہ خلوتوں میں باریاب ہونے کے بعد مداح کو محتسب بنتے دیر نہیں لگتی۔ اور یہ فتویٰ پہلے سے موجود ہے کہ محتسب را درون خانہ چکار۔ عبدالحق اور منٹو میں کوئی چیز مشترک نظر نہیں آتی۔ اسی طرح رشید صدیقی اور منٹو کی مرقع نگاری کا فن ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ رشید صدیقی زیر مطالعہ شخصیتوں کو ان قدروں کی میزان میں توہتے ہیں جو انھیں بہت عزیز ہیں۔ ان کے یہاں قدروں اور شخصیتوں کا زمانہ بڑا گہرا ہے۔ ان کے مرقعوں کو پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ان دونوں کا جواز ایک دوسرے میں ڈھونڈتے اور پاتے ہیں اور اگر وہ دونوں ایک دوسرے کا جواز نہ ہوتے تو رشید صدیقی ان میں سے کسی کے قابل نہ ہوتے۔ منٹو کے یہاں اس قسم کی کوئی میزان نہیں ملتی۔ ان کے مضامین آئینہ اور ایکس رے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آئینے میں شخصیتوں کے ظاہری خدو خال نظر آتے ہیں اور ایکس میں کردار کی اندرونی تہوں کا حال مرقع نگاری کے سلسلہ میں رشید صدیقی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ”آپ کا کسی سے خوش ہونا یا ناخوش ہونا آپ کے لئے جتنا آسان جتنا ہی یہ مشکل ہے کہ آپ اس شخص کو میری پسند یا نا پسند کا موجب بنادیں۔ جو شخص اس مرحلے سے خیر و خوبی سے گزر جائے وہی فن کار ہے۔“ ان جملوں میں رشید صدیقی اور منٹو کی مرقع نگاری کا بنیادی فرق پوشیدہ ہے۔ رشید صدیقی کا فن کسی شخصیت سے مسرور و متاثر ہو کر اسے ہماری آپ کی پسند کا موجب بنادینے کا فن ہے۔ منٹو کسی شخصیت کے متعلق نہ تو اپنی پسند یا نا پسند کا اظہار کرتے ہیں اور نہ اس کو ہماری پسند یا نا پسند کا موجب بنانے کے درپے نظر آتے ہیں۔ ان کا فن تجزیہ اور ترجمان کا فن ہے۔ وہ خود کسی کو اچھا یا برا، برگزیدہ یا بے مایہ نہیں کہتے۔ یہ فیصلہ قاری پر چھوڑ دیتے ہیں۔ مرقع نگاری کے جدید اسلوب کا تقاضا بھی یہی ہے۔

”گئے فرشتے“ بارہ مضامین پر مشتمل ہے۔ یہ بارہ مضامین بارہ شخصیتوں کے مرقعے ہیں۔ ان میں شاعر بھی ہیں اور سیاست دان بھی

ادا کار بھی ہیں اور افسانہ نگار بھی۔ ادیب بھی ہیں اور صحافی بھی کچھ اس دنیا میں اب بھی موجود ہیں کچھ اس دنیا میں مدتوں پہلے جا چکے ہیں ان میں سے ہر شخص اپنے اپنے فن میں امتیازی حیثیت کا مالک ہے۔ مٹو نے ان میں سے دو ایک کے سوا ہر ایک کو بہت قریب سے دیکھا ہے کسی کو بہت قریب سے دیکھنے میں محبت اور نفرت دونوں کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ لیکن مٹو نے نہ تو ان شخصیتوں کا پرستار بن کر مضامین لکھے اور نہ ان سے بیزار ہو کر۔ نہ اس انداز سے لکھا جیسے ان شخصیتوں پر احسان کر رہے ہیں اور نہ اس طرح کہ خود اپنے آپ پر احسان کیا جا رہا ہے۔ ان مضامین میں نہ عقیدت کو راہ دی گئی ہے اور نہ تعصب کو۔ نہ زوروں سے انتقام لیا گیا ہے اور نہ مرنے والوں کو بخش دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ رشید صدیقی نے اپنے ”گنجے گرانمایہ“ والے مضامین کے متعلق ایک جگہ لکھا ہے کہ ”ان کے لکھنے میں مجھ سے صبر و ضبط کا دامن اکثر چھوٹ گیا ہے۔ دوستوں اور عزیزوں کی تکلیف سے میں بہت متاثر ہوتا تھا اور ان کی دائمی مفارقت مجھے یک لخت زیر و زبر کر دیتی تھی۔“ لیکن ”گنجے فرشتے“ کے مضامین میں ”مرلی کی دھن“ کے سوا مٹو کے ہاتھ سے صبر و ضبط کا دامن کہیں چھوٹتا نظر نہیں آتا۔ انھیں نہ تو باری صاحب جیسے محسن کی موت زیر و زبر کرتی ہے اور نہ نسیم جیسی حسینہ عالم آشوب کا حسن۔ یہاں میں مٹو کی برتری یا فرد تری، خوبی یا خامی کی طرف نہیں بلکہ ان کی صرف ایک امتیازی خصوصیت کی طرف اشارہ کر رہا ہوں۔

جیسا کہ ابھی کہا گیا مٹو کے یہ مضامین بارہ ممتاز شخصیتوں کے مرقعے ہیں۔ لیکن ان مرقعوں میں نہ کسی کے پیدا ہونے کی تاریخ بتائی گئی ہے اور نہ کسی کے مرنے کی تاریخ۔ دراصل مرقع نگاری میں ان تفصیلات کی ضرورت ہے نہ گنجائش۔ مجھے ”نقوش“ کا شخصیات نمبر دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس میں ہمارے کئی بڑے بڑے ارباب قلم نے بھی مرقع نگاری کو سوانح نگاری کا مترادف بنا کر رکھ دیا ہے۔ مٹو کے یہ مضامین اس عیب سے پاک ہیں۔ اس میں زیر مطالعہ شخصیتوں کے حالات کے بجائے ان کی سیرت اور شخصیت کے خصوصیات پر اور کارناموں کی بجائے کردار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ البتہ عصمت چغتائی والے مضمون میں ان کے افسانوں پر تنقید بھی ہے۔ لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مضمون ایک خاص سلسلہ میں لکھا گیا تھا اور اس لئے عصمت کے فن پر تنقید ضروری تھی یہ اور بات ہے کہ عصمت کے افسانوں پر تنقید کچھ زیادہ بصیرت افروز نہیں ہے۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ مٹو نے زیر مطالعہ شخصیتوں کے خارجی حالات و واقعات سے سروکار نہیں رکھا اور اگر رکھا بھی تو اسی حد تک جس حد تک وہ شخصیت کی اندرونی گہرائی کو کھولنے میں معاون ہو سکتے تھے۔ ان شخصیتوں میں مٹو کو کتنی سیدھی اور ٹھیک لکیریں نظر آئیں۔ یہ تو آپ ان مضامین کو پڑھ کر دیکھ لیں گے۔ یہاں میں ان مضامین کی جس خصوصیت پر زور دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ مٹو ان شخصیتوں کی انفرادیت کو سمجھنے اور ان کو ایک دوسرے سے تمیز کرنے میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ۶ تصویر سے ملتی نہیں تصویر کسی کی

اردو کے بلند پایہ اور ممتاز مرقع نگار ایک دوسرے سے نہ صرف انداز بیان کے معاملہ میں علاحدہ ہیں بلکہ طریق کار کے باب میں بھی متلا فرحت انگیز کا طریق کار ایک مزاحیہ مضمون نگار کا طریق کار ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق کی مرقع نگاری کا انداز عالمانہ ہے۔ رشید صدیقی کی مرقع نگاری انشا پر فائز ہے۔ مٹو چونکہ بنیادی طور پر افسانہ نگار تھے اس لئے ان کی مرقع نگاری میں افسانہ نگار کا اسلوب کار فرما ہے۔ ان کے تمام مرقعے ابتدا، ارتقا، انتہا غرض کہ ہر جگہ افسانے معلوم ہوتے ہیں۔ ان مرقعوں میں صرف تاثرات و مشاہدات کی ترتیب افسانے کی سہی نہیں بلکہ خارجی واقعات سے داخلی شخصیت کو ربط دینے کا انداز بھی افسانہ نگار کا سا ہے۔ میں اب تک مثالوں سے گریز کرتا رہا ہوں لیکن یہاں ایک مثال دے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا۔

باری صاحب کے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں :

”ہم پی رہے تھے تو حسن عباس نے چپڑے کی خاطر باری صاحب سے کہا کہ ”آپ کی یہاں سب لوگ عزت کرتے ہیں۔ بجا بی جان آپ کو نمانی

اور پرہیز گار کی حیثیت سے جانتی ہیں۔ ان کے دل میں آپ کا اتنا احترام ہے۔ اگر وہ یہاں آجائیں تو کیا ہو؟“

باری صاحب نے کہا : ”میں کھڑکی کھول کر باہر کود جاؤں گا اور پھر کبھی ان کو اپنی شکل نہیں دکھاؤں گا۔“

باری صاحب ہمیشہ اپنی زندگی کی کوئی نہ کوئی کھڑکی کھول کر باہر کود جاتے رہے۔ یہ کھڑکی کھلی رہتی۔ مگر وہ پھر کبھی اس کو اپنی شکل نہ دکھاتے۔“

یہاں باری صاحب کے بارے میں جو بات جس طور پر دیکھی اور کہی گئی ہے وہ افسانہ نگار نمٹو کا حصہ ہے۔ فرحت اللہ بیگ،
ڈاکٹر عبدالحق اور رشید صدیقی اس بات کو اس طور پر نہ دیکھ سکتے تھے نہ کہہ سکتے تھے۔

والٹر عبدالحی اور رشید صدیقی اس بات کو اس سحر پورہ ریچرچ کے ذریعے ثابت کر چکے ہیں۔
منسٹوں نے شخصیتوں کو اجاگر کرنے کے لئے جزئیات اور تفصیلات کے انتخاب میں افسانہ نگار کی سی احتیاط کرتی ہے۔ مرکزی کوائفوں
کی خوبیاں اور خامیوں کو واضح کرنے میں ضمنی کرداروں سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا ہے۔ یہاں بھی ایک مثال ملاحظہ ہو:- منسٹو، قایدِ اعظم کی کمالت
اور عنایت کی ایک تصویر دکھانا چاہتے ہیں۔ قایدِ اعظم ایک دن مس فاطمہ جناح کے ساتھ کبھی جانے کے لئے اپنی کار منگواتے ہیں۔ ان کا نیا
ڈرائیور آزاد جو موٹر چلانے سے واقف نہیں ان دونوں کو کار میں لے کر روانہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد کیا ہوتا ہے اسے خود آزاد کی زبانی سنئے:-
”اللہ کا نام لے کر ٹیکل بچہ اسٹارٹ تو کر دی اور بڑھی صفائی سے کوٹھی کے باہر بھی لے گیا۔ پر جب کالا بارہل سے نیچے اترے وقت الال بتی کے موڑ

کے پاس پہنچا۔ جانتے ہیں۔ لالہ نبی؟ — میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ہاں ہاں“

”بس صاحب وہاں مشکل پیدا ہو گئی۔ استاد بدھن نے کہا تھا کہ بریک دیا کر موائہ ٹھیک کر لیا کرو۔ افراتفری کے عالم میں کچھ ایسے لائٹری پن سے بریک دباؤ کہ گاڑی ایک دھچکے کے ساتھ رکی۔ قائد اعظم کے ہاتھ سے ان کا سنگار گر پڑا۔ فاطمہ جناح صاحبہ اچھل کر دو بانشت آگے لگیں مجھے گالیاں دینے۔ کاٹھ تو کہو نہیں میرے بدن میں۔ ہاتھ کانپنے لگے۔ دماغ چکرائے لگا۔ قائد اعظم نے سنگار اٹھایا اور انگریزی میں کچھ کہا جس کا غالباً یہ مطلب تھا کہ واپس لے چلو۔ میں نے حکم کی تعمیل کی تو انھوں نے فنی گاڑی اور نیا ڈرائیور طلب فرمایا اور جہاں جانا تھا وہاں چلے گئے۔“

گنجے فرشتے کے مضامین میں منٹو اپنی افسانہ نویسیانہ قدرت، نفسیاتی بصیرت، اور فن کارانہ ہمدردی و بے رحمی ان تمام عناصر کو بڑے سلیقے سے بروئے کار لائے ہیں۔ یہاں اتنی گنجائش نہیں کہ ہر مضمون پر الگ الگ تبصرہ کیا جائے۔ مجموعی طور پر اتنا کہ لینے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ اس مجموعے کا ہر مرقع دلکش اور جاندار ہے۔ خصوصاً ”باری صاحب“ پری چہرہ نسیم، ”مرلی کی دھن“ اشوک کمار، اور ”بابوراؤ پٹیل“ والے مضامین میں منٹو کی عرق نگاری نقطہ عروج پر نظر آتی ہے۔

منشورے عصمت والے مضمون میں ایک جگہ لکھا ہے کہ ایک رات شاہد لطیف نے ان سے کہا: "منشور تم سے اب بھی زبان کی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔" منشور نے ڈیڑھ بجے تک تسلیم نہیں کیا کہ ان کی زبان میں غلطیاں ہوتی ہیں۔ ممکن ہے وہ اپنی زندگی کے آخری سانس تک یہ بات تسلیم نہ کر سکے ہوں لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کے یہاں زبان کی غلطیاں ملتی ضرور ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان غلطیوں سے ان کی ادبی حیثیت اور ان کے فنی مرتبے پر کوئی حرج نہیں آتا۔ لیکن اب میں ان کی زبان کی غلطیوں کی مثالیں پیش کرنے کی بجائے ان کے اندازِ بیان کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

اس بات کے ناتے میں کسی اور کو تامل ہو تو ہو مجھے ہرگز نہیں کہ منٹو ایک مخصوص انداز بیان کے مالک ہیں۔ ان کی اپنی ایک اسٹائل ہے۔ جس میں **Style** اور **Content** قسم کی کوئی چیز نہیں۔ یعنی جس طرح انگریزی ادب میں آسکر وائلڈ یا چسٹرٹن یا ہرنارڈ شا اور اردو میں رشید صدیقی یا نیا ز فحیحوری کا اسلوب اپنی چیز مخصوص اور اول کی بنا پر سہجے میں پہچانا جاسکتا ہے اس طور پر منٹو کا اسلوب نہیں پہچانا جاسکتا۔ لیکن اگر آپ ان کی تمام تحریروں کا مطالعہ کریں تو یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ان کی ہر تحریر میں ایک خاص انداز موجود ہے۔ آبی احمد سرور نے ایک جگہ منٹو کے متعلق لکھا ہے کہ وہ سمرسٹ مائٹم کی طرح کسی چیز پر ایمان نہیں رکھتے، صرف اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ انسانی فطرت بڑی عجیب و غریب ہے اور اس میں پتی بے راہ روی اور کمی زیادہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس نقطہ نظر کے علاوہ انداز بیان کے معاملہ میں بھی منٹو، مائٹم سے مشابہ ہیں۔ مائٹم کی طرح منٹو کے بیان میں آرائش بالکل نہیں۔ ان کا اسلوب سادہ، سلیس اور رواں ہے۔ ساتھ ہی دلکش اور دلنشیں بھی۔ ان کے انداز بیان میں چاشنی اور چٹخارے پیدا کرنے والی کوئی چیز نہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کی تحریریں پر اعلیٰ ہوتی ہیں۔ ادب میں ایک مخصوص انداز بیان کا مالک ہونا بڑی بات ہے لیکن اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ وہ انداز بیان قاری کی توجہ کو دلچسپی میں بدل دینے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ منٹو کے اسلوب میں یہ دونوں خوبیاں پائی جاتی ہیں اور جس کے یہاں یہ دونوں خوبیاں موجود ہوں وہ اپنے قارئین کا ساتھ چھوڑ دے تو چھوڑ دے قارئین اس کا ساتھ ہرگز نہیں چھوڑتے۔

پروفیسر تقی محمد تقی

(حلقہٴ ارباب ذوق ڈھاکہ میں پڑھا گیا)

شوہن ہائر کا نفسیاتی تجربہ

نشاة ثانیہ کے بعد نقد و جرح کی ضرب کاری سے کوئی مذہبی تحریک یا شخصیت محفوظ نہ رہ سکی، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ہوا کہ پُرانے اصنام کی جگہ نئے اصنام نے لے لی۔

قرآن حکیم کو عہد عتیق اور عہد نامہ جدید سے ماخوذ بتایا گیا اور پھر خود عہد نامہ عتیق و جدید کو مجہول ثابت کیا گیا۔ یہاں تک کہ سینٹ پال کے الفاظ کو روایتی فلسفی زینو کے شاگرد اراٹس سے منسوب کر دیا، لیکن یہ تسلیم کرنے کے باوجود کہ دیوجانس کی کتاب (جس کا سن تصنیف وسط قمری صدی عیسوی سے) زیادہ قدیم مآخذ اکثر مفقود ہو چکے ہیں اور یہ ماننے کے بعد کہ نہ صرف ارسطو کی مابعد الطبیعیاتی کتابیں مجہول ہیں بلکہ

افلاطون کی بعض تصانیف بھی ناقدین کی نظر میں جعلی ہیں۔ (ملاحظہ ہو: Introductory Notice to the Republic of Plato By Davies & Vaughan) اور باوجود اس حقیقت کے کہ یونانی فلسفے کے تمام لٹریچر (جو کم و بیش پندرہ سو برس گزر جانے کے بعد تیسری صدی عیسوی صلیبی محاربوں کے "مجاہدین" کے ہاتھوں یونانی مسودات کی صورت میں سامنے آیا) کبھی اس امکان پر غور نہیں کیا گیا کہ ممکن ہے وہ تحریریں جو یونانی فلاسفہ سے منسوب کی جاتی ہیں دوسری صدی قبل مسیح کے اسکندری اسکول کے یہود کے دعوے کے مطابق "ان کے نبیوں اور صحیفوں سے" حاصل کی گئی ہوں یا فلسفہ یونان کی تنقیدی تاریخ کے مصنف پرو فیسیر ایٹکس کے اس ارتداد کے ساتھ ساتھ کہ "مشرق کے اس دعوے کہ فلسفہ یونان ہندوستان سے ماخوذ ہے" (صفحہ ۱۷) کبھی ہر بلاس ساردا کی اس تحقیق کی طرف توجہ کی جاتی کہ خود سٹرکول برک - سٹرکاک - سرموزیو لیمیس - پرو فیسیروٹسن وغیرہم کے قول کے مطابق نہ صرف انکسا غورٹ - فینا غورٹ وغیرہ کا طلب علم کے لئے ہندوستان آنا ثابت ہے بلکہ فلسفہ یونان کا فلسفہ ہندو سے متاثر ہونا بھی یہی ہے۔

۱۔ نیابج الاسلام پادری لکھنؤ۔

The Growth of the Old Testament By H. H. Rowley M.A., D.D. ۵۷

& New Testament Criticism By F. C. Conybeare M.A.

The History of Ancient Philosophy By A. W. Benn p. 107 ۵۸

۵۹ "مختصر تاریخ فلسفہ یونان" مصنفہ ڈاکٹر دلیپ تمیل مترجمہ خلیفہ عبدالحکیم مطبوعہ حیدرآباد صفحہ ۹

A Critical History of Greek Philosophy By W. T. Stace p. 253 ۶۰

& Aristotle By W. D. Ross p. 7

۶۱ "مختصر تاریخ فلسفہ یونان" صفحہ ۱۰ - یہود کے علی الرغم فارابی - بوعلی سینا اور ابن رشد کی وجہ سے مسلمانوں کو فلاسفہ یونان سے وہ بے پناہ عقیدت

تھی کہ علامہ سپروردی کی حکمت الاشراق کے شارح علامہ قطب الدین شیرازی نے بے تکلف "افانڈیمون" پیرس، ایمانڈلس و فینا غورٹس و

سقراط و افلاطون اور ان کے امتثال کو "زمرہ اصفیاء و اولیاء اور انبیاء میں داخل کر لیا (حکمت الاشراق مع خلاصہ شرح شیرازی مترجم

مولوی مرزا محمد ہادی مطبوعہ حیدرآباد صفحہ ۲)

Hindu Superiority By Har Bilas Sarda pp. 279-282 ۶۲

اسی طرح یا تو مذہبی شخصیتوں کے تاریخی وجود سے یہ کہہ کر انکار کیا جاتا ہے کہ دراصل ان کا کوئی وجود نہیں تھا بلکہ مذہب کے علمبرداروں نے قیوم اقوام کے علم الاضنام کے دیو سی دیوتاؤں کو انسانی شکل عطا فرمادی یا اگر ان کے تاریخی وجود سے انکار ممکن نہیں ہوتا تو پھر ان کے متعلق طرح طرح کے حیا سوز اور بے بنیاد افسانے وضع کئے جاتے ہیں لیکن "فیثا غورث" کے تاریخی حالات غیر تاریخی افسانوں اور انکلوں سے مخلوط ہونے کے باوجود مشکوک نہیں ٹھہرائے جاتے اور سقراط و افلاطون کے وصل کی داستان کو چھپایا جاتا ہے، بلکہ علماء و فضلاء کے جسمانی امراض کا ذکر بھی معیوب سمجھا گیا اور اگر کسی نے چارلس ڈارون کے مانچو لیا کا ذکر کیا بھی (رسالہ لانسٹ ۱۹۵۴ء) تو اس انکشاف حقائق کو نہایت مذموم سمجھا گیا اور نتیجہ ہوا کہ تقریباً ہر فلسفی اور ادیب کی زندگی "حجابِ قدس" میں نہاں ہو گئی اور دنیا کو اس بات کا بہت کم موقع مل سکا کہ وہ کسی مفکر کی ذاتی خامیوں اور اس کے افکار میں کوئی سلسلہ ربط قائم کر سکے۔ عصر جدید کے مشہور فلاسفہ میں سے شوپن ہائر کو ہماری خوش قسمتی سے ان لوگوں نے زیادہ پسند نہیں کیا جو اپنے آپ کو جہانیت پسند کہنے پر تخر کیا کرتے ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ شوپن ہائر کی کمزوریاں اور خامیاں سامنے آگئیں اور ہمیں یہ سمجھنے کا موقع مل سکا کہ شوپن ہائر کا فلسفہ اس کی زندگی کے اہم واقعات سے کس حد تک متاثر ہوا۔

آرتھر شوپن ہائر، ۲۲ فروری کو ڈانزگ میں پیدا ہوا۔ اس کے باپ مال کے خاندانوں میں کئی افراد خللِ دماغ میں مبتلا ہو چکے تھے اور خود شوپن ہائر کا باپ بھی چڑچڑے مزاج کا تھا اور اخیر عمر میں اس کا دماغ چل گیا تھا۔ چنانچہ شوپن ہائر کو بھی اپنے باپ کا مزاج ورثے میں ملا اور شہتہ و آلام کا شکار رہا اس کو دولتِ دنیا اپنے باپ سے حاصل ہوئی جو ایک معمولی تاجر تھا، لیکن اپنی مخصوص طرزِ نگارش کے لئے وہ اپنی مال کا رہیں منت تھا جو ایک کامیاب ناول نویس تھی۔ شوپن ہائر کے باپ کے انتقال کے بعد اس کی مال جو رومانی تحریک کی علمبردار تھی۔ علی الاعلان اپنے سے کم عمر نوجوانوں سے ملنے لگی اور شوپن ہائر اپنی مال کے اس طرزِ عمل سے اتنا متنفر ہوا کہ اپنی زندگی کے آخر چوبیس سالوں میں کبھی اس سے نہیں ملا۔ شوپن ہائر کے "اعصابی اور اذیت پسند فطرت" کا عملی ثبوت تو یہ ہے کہ اس نے ایک عورت کو جو سلائی کا کام کرتی تھی صرف اس جرم پر بری طرح زد و کوب کیا کہ وہ ہالی میں ذرا مشور و غل گیا کرتی تھی اور ذہنی ثبوت یہ کہ وہ خواہشِ حیات کو ایک اندھی قوت کہتا تھا جس نے وجود میں آکر سخت غلطی کا ارتکاب کیا۔ کہا جاتا ہے کہ جہاں تا جہاں وہ اور میدانِ فلسفے نے شوپن ہائر میں قنوطیت پیدا کی، مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ لڑکپن ہی میں انسان کی مصیبت پر سوچتا رہتا تھا اور اس پر ٹھوٹا رہتا۔ چنانچہ جنوبی فرانس میں جب اس کی مال خوبصورت مناظرِ فطرت کو دیکھ کر مسرت کا اظہار کرتی تو شوپن ہائر پر یہ خیال طاری ہوتا کہ ان تنگ و تاریک مکانات میں کتنے مصیبت زدہ انسان زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں۔

A Rationalist Encyclopaedia By Joseph McCabe

pp. 332-335 & 483.

۱۔ مختصر تاریخ فلسفہ یونان صفحہ ۳۲

Encyclopaedia of Sexual Knowledge By Dr. Castles, Willy & Others

۲۔ صفحہ ۴۴ پر افلاطون کا وہ قول درج ہے جو استلذاذِ بالمش کی صریح تاثیر کرتا ہے اور صفحات ۵۱-۵۰ پر خود افلاطون کے الفاظ میں افلاطون

اور اس کے استاد سقراط کی شب و وصل کی داستان بالشریح موجود ہے۔

۳۔ "فکرِ فرنگ" مصنفہ آغا افتخار حسین مطبوعہ حیدرآباد دکن صفحہ ۱۳۷

۴۔ "تاریخ فلسفہ جدید" مصنفہ ڈاکٹر حمید محمد ذوق بنگ مترجمہ عبدالحکیم ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ مطبوعہ حیدرآباد دکن جلد دوم صفحہ ۲۵۰

A History of Modern Philosophy By Prof. W.K. Wright p. 358.

۵۔ تاریخ فلسفہ جدید مترجمہ خلیفہ عبدالحکیم جلد دوم صفحہ ۲۵۱

A History of Philosophy By Wright.

A History of Modern Philosophy By Prof. Wright page 358

The World as Will & Idea By Schopenhauer

۶۔ تاریخ فلسفہ جدید مترجمہ خلیفہ عبدالحکیم جلد دوم صفحہ ۲۵۱

لہذا یہ کہنا صحیح ہوگا کہ چونکہ شوپن ہائیر بالطبع قنوطی تھا لہذا اسے جہاں تا جہاں اور ویدانت کا فلسفہ پسند آیا۔ لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ وہ جان سے بیزار ہونے کے باوجود زندگی کا دلدادہ اور موت سے بے انتہا خائف تھا۔ چنانچہ اسے ۱۸۳۱ء میں برلن کے قیام کو صرف اسیلے ترک کر دیا کہ وہاں ہیضہ تھا یہی نہیں بلکہ وہ "اپنی گردن کو حجام کے استری سے بھی بچائے رکھتا تھا اور سر ہانے بھرا ہوا پستول رکھ کر سوتا تھا"۔

ڈاکٹر میرلڈ ہوفڈنگ نے شوپن ہائیر کے دوست اور سوانح نگار گورنر (Gwinner) کے حوالے سے تحریر کیا ہے کہ شوپن ہائیر کو "بڑھاپے سے بہت اطمینان قلب حاصل ہوا کیونکہ اس کا عمر کہ پہنچ کر شہوانی جذبات سے اسے چھٹکارا مل گیا۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مغلوب الشہوت تھا اور ایک بار وہ وینس میں "میتائے حیات" کو چھو کر لذت حیات کے حصول میں منہمک ہو گیا۔ یہاں "اپنی معشوقہ کے ساتھ ٹھہرتے ہوئے ایک مرتبہ ہائیر سے بھی اُس کی ملاقات ہو گئی، جو ان دنوں وینس میں تھا، لیکن بظاہر فنون لطیفہ کے علاوہ اسے کسی اور شے سے لذت کا حصول نہیں ہوتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ سیگمنڈ فرایڈ کے نظریہ کے مطابق شوپن ہائیر فریب سے متاثر تحت الشعور تعلقات جنسی سے لطف اندوزی کو مذموم خیال کرتا ہو، بہر حال یہ تعلقات جنسی کو بڑی حد تک بے لذت سمجھتا تھا اور گوشتے اور ہائیرن کی ان نظموں کو جن میں اُن دونوں نے حسن و عشق کی دلچسپ داستان مزے لے لے کر بیان کی ہے اصل حقیقت کے بجائے ان کے حسن تخیل پر مبنی سمجھتا تھا۔

وینس میں لذت حیات کے حصول کی سعی ناکام کے بعد شوپن ہائیر فلسفے کے پروفیسر کی حیثیت سے برلن آیا لیکن لیکچرار کی حیثیت سے اس کو کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ وہ حقیقت میں اس کام کے لئے موزوں نہیں تھا علاوہ ازیں بغض و حسد سے اس نے اپنے درسوں کے لئے وہی اوقات منتخب کئے جن میں ہنگل اپنے نہایت ہر دل عزیز درس دیتا تھا۔ ہنگل کے انتقال کے بعد شوپن ہائیر درس و تدریس کے سلسلے کو ترک کرنے کے بعد فرینک فورٹ میں عزت گزریں ہو کر تصنیف و تالیف کے کام میں مشغول ہو گیا مگر بہ حیثیت مصنف جب اس کو کوئی کامیابی نہیں ہوئی تو اس کے قنوط میں اور اضافہ ہو گیا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ حاسد پروفیسروں نے اس کے فلاح سازش کی ہے کہ اُس کی کتابیں کوئی نہ خریدے۔ اس جذبہ انتقام نے شوپن ہائیر کو فلاسفہ سے بھی بدظن کر دیا اور ان کے فلسفے بھی ایک موقع پر اس نے تمام جرمن قوم کی فلسفیانہ افتاد و طبیعت کی ان الفاظ میں مذمت کی کہ جو شے زمین پر

۱۔ A History of Modern Philosophy By Wright p. 358

۲۔ "حکایت فلسفہ" مصنفہ دل ڈورن ایچ ڈی مترجمہ احسان احمد مطبوعہ حیدر آباد دکن صفحہ ۳۸۶

۳۔ تاریخ فلسفہ جدید مترجمہ عبدالحکیم جلد دوم صفحہ ۲۶۰

۴۔ حوالہ سابق صفحہ ۲۵۸

۵۔ The Basic Writings of Sigmund Freud By Dr. Brill

۶۔ The Wisdom of Life By Schopenhauer Translated by

T. Bailey Saunders M.A. page 5

۷۔ "تاریخ فلسفہ جدید" مترجمہ پروفیسر عبدالحکیم جلد دوم صفحہ ۲۵۸ - حوالہ سابق

۸۔ "کانٹ کی تصانیف کا مطالعہ کرنے کے بعد عوام الناس کو اس امر کا احساس ہو گیا تھا کہ ہر مغلق عبارت بے معنی نہیں ہوتی اور فٹے اور شلنگ

نے عوام کے اس احساس سے فائدہ اٹھا کر ابجد طبیعیات میں مغلق مگر بے معنی الفاظ کا بکثرت استعمال کیا لیکن قطعاً مہمل اور بالکل بے معنی الفاظ جو اس قبل صرف پاگل قانون میں سننے میں آتے تھے درجہ اتم ہنگل کی تصانیف میں استعمال کئے گئے ہنگل کے فلسفے میں اس طلسم الفاظ کی وجہ سے ایک ایسے عجیب و غریب تصوف کا نشوونما ہوا ہے جس سے دنیا آشنا تھی اور جو اب لاابادیک جرمن قوم کی حماقت کی یادگار رہے گا۔

۹۔ The Story of Philosophy By Will Durant p. 292

موجود ہوتی ہے اسے وہ آسمان پر تلاش کرتے ہیں۔ اسی سلسلہ میں شوہن ہائر نے اپنے جملے دل کے پھپھوے یوں پھوڑے ہیں کہ "خیر و شر، جبر و اختیار وغیرہ کے مسائل پر فلاسفہ کے افکار بے انتہا مبالغہ آمیز، مبہم، بعید الفہم اور بے معنی ہوتے ہیں اور اس وقتی اور مخصوص رجحان کے آئینہ دار ہوتے ہیں جو ہر فلسفی سے مختص ہوتا ہے۔" معاصرین کے بعض وحسد سے شوہن ہائر کو نہ صرف ان کی نکتہ چینی پر آمادہ کیا بلکہ متوسطین اور متقدمین بھی اس کی تیغ زبان سے محفوظ نہیں رہے۔ شوہن ہائر نے اپنے قابل پیش رو کانٹ کے نظریۂ اہمیت انسانی کی پر زور تردید کی اور اپنے ایک مضمون میں ان خیالات کا اظہار کیا کہ "جب تک مجھ ایسے عبقری کی اخلاقیات کو پروفسروں کی دنیا میں نظر انداز کیا جائے گا۔ صرف اسی وقت تک کانٹ کا فلسفہ یونیورسٹیوں میں رائج رہے گا۔"

اس کے نزدیک دولت کی کوئی وقعت نہیں تھی۔ لیکن اس کے باوجود اس نے فریڈک فورٹ کے قیام میں "اپنے مال و دولت کو تباہی سے بچانے کے لئے بڑی کاروباری قابلیت کا اظہار کیا۔" اور پادریوں، سیاسی رہنماؤں اور مقننین کی یہ کہہ کر توہین کی کہ "دنیا کے جلسے رقص میں سب لوگ نقاب پہن کر آتے ہیں۔ کسی کے منہ پر حسب وطن کی کسی کے منہ پر قانون کی مگر مطلب سب کا جلد منفعت ہے۔" تاجروں کی اس طرح مدح کی کہ "اس رقص گاہ میں اگر کوئی بے نقاب آتا ہے تو وہ صرف تاجر ہے۔"

شہرت کے متعلق بھی اس آدم بیزار بلکہ عالم بیزار فلسفی کے خیالات عجیب و غریب تھے۔ وہ کہتا تھا کہ "شہرت اضافی چیز ہے اور بڑبڑیں اس کی قیمت بالواسطہ ہے۔" لیکن جب ۱۸۴۹ء کی ناکام بغاوت کے بعد جرمن عوام پر قنوطیت کا غلبہ ہوا اور ہیکل کے اسکول میں اختلاف واقع ہونے کی وجہ سے فلسفیانہ طبائع بار دیگر انتقادیت کی طرف مایل ہوئے تو شوہن ہائر کے بھی دن پھرے اور "لوگوں نے اس کی تصانیف کی طرف زیادہ توجہ کرنا شروع کی اور شوہن ہائر شہرت کا اتنا دلدادہ ہو گیا کہ "اپنے شاگردوں کو تاکید کی جو مداحانہ تنقید شائع ہو وہ ضرور اس کو بھیج دیا کریں۔"

"On Human Nature" By Schopenhauer Translated By
T. Bailey Saunders page 37

۱۲ "فلاسفہ متقدمین میں غلط بحث کا عجیب موجود تھا۔ وہ ایک موضوع میں بے انتہا غیر متعلق مباحث چھیڑ دیا کرتے تھے۔ اس غلط بحث کی بدترین مثال افلاطون کے ہر مکالمہ میں موجود ہے۔"

Human Nature By Schopenhauer page 115.

Foundation of Morality By Schopenhauer

On Human Nature By Schopenhauer page 4.

The Wisdom of Life By Schopenhauer

۱۶ تاریخ فلسفہ جدید مترجمہ عبدالحکیم جلد دوم صفحہ ۲۵۸

On Human Nature By Schopenhauer page 16

۱۷ حوالہ سابق صفحہ ۱۷

The Wisdom of Life p. 126

A History of Modern Philosophy By Wright page 358

۱۸ تاریخ فلسفہ جدید مترجمہ عبدالحکیم جلد دوم صفحہ ۲۵۹

۱۹ حوالہ سابق صفحہ ۲۶۰

شوپن ہائر جبر محض کا قائل تھا اور مسئلہ اختیار کو یہودیت کا پر تو سمجھتا تھا۔ عقیدہ جبر میں اسے اس حد تک غلو تھا کہ اپنے ایک مضمون کے سلسلہ میں اس نے صاف صاف کہا ہے کہ ”یہودیت کا مسئلہ اختیار ہر طرح اور ہر قسم کے فلسفیانہ علم کی راہ میں شگبار ہے۔“ اس نے ۱۸۴۲ء میں قید حیات و بند غم سے نجات پائی اور اگرچہ ڈاکٹر ہیرلڈ ہوفٹنگ کے نزدیک نہ فلسفہ کی کلیت کا خیال سب سے پہلے اسی کے دل میں پیدا ہوا اور نہ ارادہ کے جوہر عالم ہونے کی تحنیل کی اولیت کا شرف شوپن ہائر کو حاصل ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ شوپن ہائر ان نظریات کو صریح الفاظ میں بیان کرتا تھا۔ یہی اس کی قنوطیت تو وہ ایک حد تک تو اس کے اعصابی مزاج کا نتیجہ بھی اور ایک حد تک اس کی ماں کی نفرت کی رہین منت تھی، جس نے کبھی تو شوپن ہائر کو اس طرح کے سخت الفاظ خط میں تحریر کئے: ”تم میرے لئے ناقابل برداشت بوجھ ہو اور تمھارے ساتھ گزر ہونا بہت مشکل ہے۔ تمھاری جتنی خوبیاں بھی ہیں ان سب پر تمھارے غور کی وجہ سے پانی بھر گیا ہے اور وہ دنیا کے لئے محض اس وجہ سے بے کار ہیں کہ تم دوسروں میں عیب جوئی کرنے کے رجحان کو نہیں دبا سکتے“ اور کبھی ”کسی فیصلہ کن جھگڑے میں اپنے بیٹے اور حریت کو سپر ہیروں پر سے ڈھکیل دیا۔“

کیا خوب قول ہے ڈاکٹر ویل ڈوان کا کہ ”ایسا شخص جس کو محبت مادرسی نہ نصیب ہوئی ہو بلکہ اس کے برعکس ماں کی نفرت نصیب ہوئی ہو اس کے لئے دنیا سے محبت رکھنے کی وجہ نہیں ہو سکتی۔ شوپن ہائر نے محبت اور دنیا کے حصول کی کوشش کی اور نتائج ایسے ہوئے جن سے اس کی سیرت اور فلسفہ دونوں متاثر ہوئے۔“

طالب صفوی

On Human Nature By Schopenhauer page 70

۱

۲۰۰۰ سابق صفحہ ۸۷

History of Philosophy By Alfred Weber Translated By Frank Thilly page 446.

۳

۴ تاریخ فلسفہ جدید مترجمہ عبدالحمید جلد دوم صفحہ ۲۵۷

A History of Philosophy By Windelband

۵

۶ ”وہ مطلقاً تنہا تھا اور ایک دوست بھی نہ رکھتا تھا۔ اپنی زندگی کے آخر تیس سال اس نے دو کمروں میں گزارے جہاں ایک کتے کے

علاوہ جسے وہ آتا کہا کرتا تھا اس کا اور کوئی رفیق نہ تھا۔“ حکایت فلسفہ صفحہ ۹۰ - ۳۸۷۔

۷-۹ ”حکایت فلسفہ مصنف ول ڈوران پی۔ ایچ۔ ڈی۔ مترجمہ احسان احمد صفحہ ۸۲ - ۳۸۵۔“

نگار کے پچھلے مکمل فائل

۱۹۵۵ء سے ۱۹۵۷ء تک کے ہر حساب پندرہ روپے فی فائل مل سکتے ہیں، لیکن یہ تمام فائل ایک ساتھ فروخت ہوں گے۔

قیمت جملہ فائل ایک سو پانچ روپیہ معہ محصول

مینجر نگار لکھنؤ

گاہے گاہے باز خواں !

مذہب کا زاویہ نگاہ

آپ روز سورج کو طلوع کرتے ہوئے دیکھتے ہیں، جتنا وہ آفتاب سے بلند ہو جاتا ہے اس کی حرارت کو زیادہ محسوس کرتے جاتے ہیں، پھر آہستہ آہستہ وہ آپ کے سر سے گزرتا ہوا دوسری سمت کی طرف رفتہ رفتہ ٹکا ہوں سے غائب ہو جاتا ہے۔ یہ کیا ہے؟ — آپ اسے واقعہ کہتے ہیں کیوں؟ اس لئے کہ آپ کا مشاہدہ ہے، آپ اپنے حواس کے ذریعہ ایسا محسوس کرتے ہیں اور متواتر دہرے درپے اتنی مرتبہ محسوس کر چکے ہیں کہ اگر کوئی شخص آپ سے آکر یہ کہے کہ آج آفتاب نے طلوع نہیں کیا، یا یہ کہ طلوع کرنے کے بعد غروب نہیں ہوا تو آپ اسے جھوٹا کہیں گے اور آپ باہر نکل کر اس کی تصدیق بھی نہیں کریں گے۔ انسان میں جو یہ کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کا نام یقین ہے۔ اور یقین بھی ایسا جس کے لئے کسی برہان و دلیل کی حاجت نہیں۔

انسان کی زندگی پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ وہ ایک سلسلہ ہے بے شمار ”لمحات احساس“ کا یہاں تک کہ اگر آپ اس کو ”احساس مسلسل“ کہیں تو بیجا نہ ہوگا، لیکن ”احساس محض“ بیکار ہے اگر دنیا میں محسوسات کا وجود نہ ہو، اس لئے انسان فطرتاً مجبور ہے کہ وہ اپنے ”ذوق احساس“ کو پورا کرنے کے لئے محسوسات کا مطالعہ کرے، انسان فطرتاً سکون کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے اور سکون نام ہے صبر ”یقین“ کا۔ ریب و شک، ایک بے چینی ہے، ایک اضطراب ہے اور انسان اس الجھن کے دور کو بے قدرت کی طرف سے مجبور ہے اس لئے اگر اس کے ”احساسات“ مطمئن نہیں ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ”سکون یقین“ کی منزل سے نا آشنا ہے اور ”احساس“ کا اطلاق ان اگر ہو سکتا ہے تو صرف محسوسات کی نسبت جو کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچنے سے۔

عام طور پر محسوسات کی دو قسمیں بتائی جاتی ہیں، ایک محسوسات خارجی، دوسرے محسوسات ذہنی۔ یعنی ایک وہ جو خارج میں موجود ہیں جیسے درخت، پتھر، پانی وغیرہ اور دوسرے وہ جن کا بظاہر وجود نہیں پایا جاتا لیکن ہم انہیں محسوس کرتے ہیں جیسے گرمی، سردی وغیرہ۔ مگر میرے نزدیک یہ تقسیم صحیح نہیں کیونکہ محسوسات جتنے بھی ہیں تمام تر خارجی ہیں اور جن کو ”ذہنی“ کہا جاتا ہے وہ بھی کسی نہ کسی واسطہ سے محسوسات خارجی ہی سے پیدا ہوتے ہیں، یقیناً گرمی، سردی کوئی مادی محسوس چیز نہیں لیکن جن اسباب کے تحت گرمی یا سردی محسوس کی جاتی ہے، وہ ”خارجی“ محسوسات سے باہر نہیں۔ بیشک محبت و نفرت کا احساس بالکل ذہن سے متعلق ہے لیکن کیا وہ چیز جن سے یہ جذبات متعلق ہیں خارج میں موجود نہیں؟ مادہ اور اعراض دو علیحدہ علیحدہ چیزیں بتائی جاتی ہیں، درحالیکہ عرض کا وجود مادہ سے کہیں علیحدہ نہیں، پھول ہے تو رنگ بھی ہے، بو بھی ہے وہ نہیں تو یہ بھی نہیں۔

یقین کے کئی مراتب و مدارج ہیں۔ ہم دور سے دھواں اٹھتا ہوا دیکھتے ہیں اور یقین کر لیتے ہیں کہ وہاں آگ کا وجود ہے لیکن آگ کی نوعیت کیا ہے اس کی خبر نہیں ہوتی، ہم چل کر وہاں جاتے ہیں اور اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ کسی نے خس و خاشاک جمع کر کے اس میں آگ لگا دی ہے۔ ہم وہاں سے واپس آتے ہیں، لوگ پوچھتے ہیں کہ آگ کیسی ہے؟ ہم بتا دیتے ہیں وہ شکر

مطمئن ہو جاتے ہیں، لیکن کیا ان کا یہ اطمینان اس درجہ یقین کو پہنچ سکتا ہے جو ہمیں حاصل ہے۔ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ ہم کہہ دیتے کہ کسی نے لکڑی جلائی ہے اور وہ یقین کر لیتے۔

ہمیں ایک گھڑا مٹی کا نظر آتا ہے۔ اس کی تازگی دیکھ کر سمجھ لیتے ہیں کہ اس میں پانی ہے، قریب جا کر پانی کو دیکھتے ہیں تو یقین ہو جاتا ہے لیکن جب گلاس میں پانی لے کر پی لیتے ہیں تو یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ سرد ہے یا گرم۔

غور کیجئے کہ یقین کے ان تمام مدارج میں ”مطالعہ محسوسات“ کو کتنا دخل ہے۔ اگر خود اپنی سعی و کوشش سے کام لے کر خود اپنی عقل و احساس کو ذریعہ بنا کر کوئی علم حاصل ہو، تو وہ ایک ”یقین ذاتی“ ہے جسے کوئی قوت متزلزل نہیں کر سکتی، لیکن اگر ہم نے صرف دوسروں کی زبانی سن کر کسی بات کو باور کر لیا ہے تو وہ محض ”یقین روایتی“ ہے جس میں ریب و تزلزل کا زیادہ امکان ہے اور تصدیق قلب کا بہت کم۔

تصدیق کی یہ منزل اور سکون نفس کا یہ مرتبہ از خود حاصل ہونے والی چیز نہیں بلکہ پیدا ہوتا ہے محسوسات و موجودات کے مطالعہ سے، پھر یہ مطالعہ جتنا غائر ہوگا اتنا ہی صحیح ہوگا اور یہی وہ چیز ہے جس نے دنیا میں علوم و فنون کی بنیاد ڈالی اور انسان کے اقتدار کو تمام روئے گیتی پر قائم کر کے اسے خلافت الہی کی منزل سے روشناس کیا۔ آئیے ذرا مدارج خلافت پر بھی غور کریں۔

میں ایک وزنی گیند ہوا میں اچھالتا ہوں، وہ فوراً پیچھے آجاتی ہے، بار بار پھینکتا ہوں وہ بار بار زمین پر آکر گرتی ہے۔ میں یہ فیصلہ کرتا ہوں کہ بھاری چیز کبھی اوپر نہیں ٹھہر سکتی۔ دوسرا شخص اس پر زیادہ غور کرتا ہے اور وہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ وزن خود کوئی چیز نہیں ہے بلکہ نام ہے صرف کشش زمین کا۔ تیسرا ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے اور سوچتا ہے کہ زمین کی کشش کا مقابلہ کیونکر ہو سکتا ہے، یہاں تک کہ وہ غبارہ اور ہوائی جہاز بنا کر اس مقابلہ میں کامیاب ہو جاتا ہے آج دنیا کا تمام ہنگامہ ترقی اسی مطالعہ پر قائم ہے اور اسی یقین کی سرزمین سے ارتقاء کے چشمے پھوٹے ہیں، ایک زمانہ وہ تھا کہ انسان کو خود اپنے ملک کی بھی خبر نہ تھی، آج وہ نہ صرف کرۂ ارض بلکہ فضا میں تیرنے والے کوردوں اور ابروں میں دور کے کربوں کا حال معلوم کر چکا ہے یہ سب کمرے میں یقین کے، جو نتیجہ ہے علم کا۔

ایک شخص سوال کرتا ہے کہ اس تمام جدوجہد سے فائدہ؟ جبکہ انسان کو بہر حال فنا ہونا ہے۔ سوال ممکن ہے صحیح ہو، لیکن استدلال غلط ہے۔ انسان انفرادی حیثیت سے خالی ہے، لیکن اجتماعی حیثیت سے اس کو بقا و دوام حاصل ہے، انسان کی موجودہ صورت بدل سکتی ہے اس کے عادات و اطوار میں تغیر ہو سکتا ہے، اس کے افراد یقیناً فنا ہوتے جائیں گے، لیکن انسان بہر حال باقی رہے گا۔

انسان فطرت کی تخلیق کا مظاہر ہم ہے اور اگر آفرینش کو فنا ہے تو انسان کو بھی ور نہ نہیں۔ اس لئے انفرادی نقطہ نظر سے گفتگو کرنا، مقتضائے فطرت کے خلاف ہے، قدرت کے مرضی کے منافی ہے۔

آپ سمندر کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک ناقص ہی سلسلہ ہے موجوں کا، درآئیکہ ہر موج اپنی جگہ اٹھ کر فنا ہو جاتی ہے، پھر کیا سمندر کا وجود ان موجوں کے فنا ہونے سے ختم ہو جاتا ہے، جو موج اس لمحہ میں نمودار ہو کر فنا ہوئی ہے اسے پھر نہیں اُبھرنا، لیکن کیا اس سے سمندر کو کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے بالکل ہی عالم انسانی کا ہے کہ اس کے افراد مٹتے جاتے ہیں۔ لیکن وہ علیٰ حالہ اپنی جگہ قائم ہے اور ہمیشہ قائم رہے گا۔

دنیا کے مذہب کے اصول گہرے اور میں وہاں علم و یقین کا نام اعتقاد ہے اور اس کی تعلیم ”کل شئی حادث“ (ہر چیز فنا ہونے والی ہے) کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے، مذہب کے نزدیک انسان نہایت حقیر حد درجہ بے بس و بے کس اور مجبور و لاچار چیز ہے، اس کی کوئی حرکت اور اس کا کوئی خیال اس کے اختیار میں نہیں، جو چاہتا ہے خدا کرتا ہے اور جو چاہے گا کرے گا، انسان کا کام صرف سرعجز جھکا دینا ہے، اور آنکھ بند کر کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ کر دوسری دنیا کے اس عمیق و تاریک غار کی طرف چلا جانا جس کا علم صرف اس قدر حاصل ہے کہ ”معلوم نہیں“۔

مذہب کہتا ہے کہ انسان دنیا میں صرف اس لئے آیا ہے کہ وہ عبادت کرے اور خدا کی پرستش میں رات دن مصروف رہے، لیکن اس سے پوچھئے کہ خدا کیا، اور اس کی پرستش کیوں؟ تو وہ کہتا ہے کہ خدا کی حقیقت پوشیدہ ہے کسی کی قدرت نہیں کہ اس کو سمجھ سکے اور عبادت اس لئے کہ اس نے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے اس نے جس کا حال معلوم نہیں، الغرض مذہب کے تمام عقاید کا عنصر عظیم ”عدم علم“ ہے اور اسی نہ سمجھ سکے، نہ جان سکے کا نام وہاں یقین رکھا جاتا ہے۔

پھر اگر ”عدم علم“ کوئی مستقل تعلیم ہوتی تو بھی ایک بات تھی، لیکن چونکہ انسان کی فطرت جستجو پسند ہے اور وہ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھتا جب تک اس کی یہ فلتش دور نہ ہو، اس لئے مذہب اس پر بھی قائم رہ سکا اور باوجود اس کے کہ وہ خود خدا کو نہیں سمجھ سکا تھا، لوگوں کو اس نے سمجھایا، باد صفت اس کے کہ وہ دوسری دنیا سے بے خبر تھا، دوسروں کو اس سے آگاہ کیا اور اس شان سے اس اعتماد و یقین کے ساتھ کہ یہ سب کچھ گویا حقائق ثابتہ میں شامل ہے اور محسوسات ظاہری سے متعلق ہے۔

چنانچہ وہی جس کی حقیقت کو وہ نہیں پاسکتا تھا دفعۃً خفا سے ظہور میں آجاتا ہے اور اس انداز سے کہ وہ کرسی پر بیٹھا ہوا ہے، چاروں طرف اس کے خدام (ملائکہ مقررین) حضوری میں حاضر ہیں، وہ اپنے خاص خاص بندوں سے ہمکلام ہوتا ہے، جس سے خوش ہوتا ہے اس کو فردوس بھیج دیتا ہے جس سے برہم ہوتا ہے اس کو آگ میں جھونک دیتا ہے، وہ سنتا ہے لیکن کان نہیں رکھتا وہ دیکھتا ہے مگر آنکھوں سے نہیں وہ بولتا ہے مگر زبان سے نہیں، الغرض وہ دنیا ہی کے بادشاہوں کی طرح ایک علیل القدر بادشاہ ہے اور اس پر کوئی دوسرا حکمراں نہیں۔ وہ بے نیاز مطلق ہے، لیکن ہماری عبادتوں کی پروا ضرور کرتا ہے وہ احتیاج سے بلند وارفیع ہے، لیکن ہمارے عجز و نیاز کی اس کو ضرورت ہے، وہ کسی چیز سے متاثر نہیں ہوتا، لیکن نافرمانی سے اس کو غصہ یقیناً آتا ہے وہ بے انتہا رحم و کرم والا ہے، مگر گناہ گار کو بغیر آگ میں جھونکے نہیں مانتا۔

وہ موجود ہے لیکن زمان و مکان سے بے نیاز، وہ ہر لمحہ میں قہیم ہے، لیکن لمحہ فدا ہو جاتا ہے اور وہ نہیں، وہ عادل ہے لیکن عدل کا پابند نہیں، جس کو چاہے بخش دے اور جسے چاہے سزا دے۔ علم کہتا ہے کہ یہ اجتماع اضداد کیسا، مذہب کہتا ہے کہ خدا کی مرضی، علم کہتا ہے کہ یہ تمام باتیں کیونکر معلوم ہوئیں، مذہب کہتا ہے، خدا کے برگزیدہ بندوں کے کہنے سے، علم کہتا ہے کہ ان کی برگزیدگی کا علم کیونکر ہوا، جواب ملتا ہے کہ انھیں کے قول سے۔ علم سوال کرتا ہے کہ کیا انسان بغیر تحقیق کئے ہوئے محض دوسروں کے کہنے پر اپنے نفس کو مطمئن کر سکتا ہے۔ جواب دیا جاتا ہے ”کیوں نہیں“ علم پوچھتا ہے کہ کیا یقین اسی کا نام ہے۔ مذہب کہتا ہے ”بیشک“

مذہب کی تعلیم ہے کہ یہ دنیا جس میں انسان زندگی بسر کرتا ہے، یعنی محسوسات کی یہ ٹھوس دنیا بالکل عارضی چیز ہے اور محض ایک پر تو ہے اس دوسری دنیا کا جو ہمیشہ قائم رہنے والی چیز ہے۔ مگر وہ دوسری دنیا کیسی؟ اس میں بہشت ہے، دوزخ ہے، دیدار خداوندی ہے یا اس سے ہجوری، باغ و راز ہے، حور و قصور ہیں، فواکہ و اشجار ہیں، دودھ اور شہد کی نہریں ہیں، کوئی فکر نہیں، ہر وقت آزادی سے کھا دپیو اور وہ سب کچھ کرو جس سے اس دنیا میں باز رکھا جاتا ہے۔ یا پھر دہکتی ہوئی آگ کے غار ہیں، آزد ہے ہیں، بچھو ہیں، خون و پیپ ہے، پیچ ہے کراہ ہے۔ پوچھئے: کیا وہاں رقص و سرود بھی ہے۔ کیوں نہیں درختوں پر چڑیاں چہچہا رہی ہوں گی۔ کیا وہاں موٹر، ہوائی جہاز، ریل بھی ہے۔ بے شک، انسان نے کسی جگہ پہونچنے کا خیال کیا اور فوراً پہونچ گیا۔ یعنی:

”آنکھ کی بند ہوا کو پتہ جاناں پیدا“

کیا وہاں ”زہرہ صبح و جام بلور“ بھی سیر ہے۔ اس کا کیا ذکر کیونکہ وہاں تو ہر وقت صبح صادق ہی رہے گی اور جام بلور کیا معنی، وہاں تو دنیا کے قیمتی سے قیمتی جواہر سنگریزوں کی طرح بکھرے ہوئے فطر آئیں گے۔ بالکل درست لیکن پوچھئے کیا انسان کو کسی

شے کے حصول کے لئے جدوجہد کرنا پڑے گی، کیا یہ دھڑکا لگا رہے گا کہ ممکن ہے فلاں چیز ہم کو نہ ملے، یا ملنے کے بعد ہاتھ سے نکل جائے۔ اس کا جواب بالکل نفی میں ملے گا۔ پھر تماشہ یہ ہے کہ فطرت انسانی تو بدستور اس دنیا میں بھی یہی رہے گی، لیکن لذت و الم کا مفہوم بالکل بدل جائے گا۔ گویا ان کا وجود احساس انسانی اور اس کی فطرت سے علیحدہ قائم ہے۔

اب ذرا گہرائی کی طرف جائیے اور غور کیجئے کہ مرنے کے بعد انسان کا ایک زمانہ غیر معلوم تک عالم برزخ میں رہنا اور پھر بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ”پل صراط“ پر چل کر دوزخ یا جنت تک پہنچ جانا کیا غایت رکھتا ہے، کہا جاتا ہے کہ مصلحت خداوندی ہر جگہ اور سہرات میں کار فرما ہے لیکن موت کے بعد انسان کا تمام سخت و صعب مراحل سے گزر کر عذاب یا ثواب کی دائمی زندگی بسر کرنا کس نتیجہ کے لئے ہے، بہشت و دوزخ سے کسی کو لوٹ کر پھر دنیا میں جانا نہیں کہ وہاں کے لوگوں کو ان کے حالات معلوم کر کے تحویف یا ترغیب ہو۔ پھر خدا کی اس میں کیا مصلحت ہو سکتی ہے کہ وہ انسان کو زندگی دوام عطا کر کے بقا میں اپنا شریک تو بنا لیتا ہے لیکن دنیا والوں کے لئے مایہ جبرت و بصیرت بنانے کے لئے طیار نہیں۔

صدیاں گزر گئیں کہ مذہب کی یہ تعلیمات بدستور اسی مفہوم کے ساتھ دنیا میں کار فرما ہیں۔ یہاں تک کہ علم نے بڑھ کر اسکو چیلنج دیا، ظاہر ہے کہ مشاہدات کا جواب قیاسات سے اور ”یقینیات“ کا مقابلہ ”مکانات“ سے نہیں ہو سکتا تھا، اس لئے ایک گروہ ایسا پیدا ہوا جس نے عقائد مذہب کے ظاہری معنی سے عدول کر کے ایک باطنی مفہوم پیش کیا اور بتایا کہ یہ صرف تشبیہات و استعارات ہیں۔ لوگوں کو متاثر کرنے کے لئے خطیبانہ انداز بیان ہے لیکن افسوس ہے کہ وہ مراسم و شعائر میں کوئی تبدیلی نہ پیدا کر سکا اور اس جواب کی حقیقت جان چھڑانے سے زیادہ اور کچھ نہ رہی، علم کو اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ پیچھے مڑ کر دیکھتا، سیلاب کی طرح اٹھا اور درمیان کے تمام چٹانوں کو کاٹتا ہوا چلا گیا۔ جن پہیروں کے ساتھ دینا تھا وہ ساتھ چلی گئیں، جن کو یہ منظور نہ تھا وہ اپنے منتشر اجزاء لئے ہوئے پیچھے رہ گئے اور مذہب عالم کا بھی حشر ہوا۔

مگر دنیا کے تمام مذاہب میں ایک مذہب ایسا تھا جو اس طوفان کا ساتھ دے سکتا تھا، علم کے اس سیلاب کا شکار بن سکتا تھا، لیکن اس کو دنیا فراموش کر چکی ہے، خود اس کے ماننے والے اس کی حقیقت سے بے خبر ہیں اور اگر کوئی انھیں یہ بھولا ہوا سبق یاد دلاتا ہے تو اسے باغی سمجھ کر نکال دیتے ہیں۔ اس مذہب نے کبھی اس بات کی تلقین نہیں کی کہ ہم بغیر سمجھے ہوئے لغو اعتقادات کا اتباع کرو بلکہ اس نے ہمیشہ اسی بات پر زور دیا کہ اپنی فکر و کوشش سے کام لو، غور و تدبیر کرو، کائنات کا مطالعہ کر کے حقائق اشیا کا علم حاصل کرو، دنیا میں ہمیشہ آگے قدم بڑھاؤ اور ترقی کی اس چوٹی تک پہنچ جاؤ جہاں سے نیابت خداوندی کا اعلان کیا جاسکتا ہے، اس نے یہ بھی بتایا کہ نیابت خداوندی کیا ہے، وہ انسان کی انتہائی کامیاب تمناؤں کی ہیئت ہے، استعلا و ترقی کی سکون بخش جنت ہے، کامرانیوں کی سلسبیل ہے، مسرتوں کی جوئے بار ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی سمجھا دیا کہ اگر انسان نے یہ سب کچھ حاصل کرنے کی کوشش نہ کی، تو ذلت و نکبت کی آگ ہے، پستی و خسران کے دل جلادینے والے شعلے ہیں، اور پامالی کی وہ تکلیفیں ہیں کہ سانپوں کی پھینکار اور بچھوکے نیش بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔

مگر بے کوئی آج، جو صرف اس تعلیم کو اساس مذہب بتائے اور ہے کسی میں ہمت جو پوست کو علیحدہ کر کے مغز پیش کرے۔ علم اپنا ”یقین“ کا پرچم لئے ہوئے آگے بڑھتا جا رہا ہے۔ کائنات کو فتح کر کے بہشتوں اور جنتوں کو اپنے لئے مخصوص کرتا جا رہا ہے، لعالم دلہائے کو سمیٹ سمیٹ کر دامن مراد بھر رہا ہے۔ لیکن مذہب بدستور اپنے مکانات کے اوہام میں مبتلا ہے، قیاسات کی دل میں گرفتار ہے اس نے منہ پشت کی طرف کر لیا ہے اور کہہ رہا ہے منزل ادھر ہے وہ سکون کا طلب گار ہے وہ سکون جس میں موت کی سی غفلت ہو، پتھروں کا سا جمود ہو وہ کہتا ہے کہ اس دنیا کی پامالی دیکھو دنیا کا عروج ہے، یہاں کی ذلت و غناں کی عزت ہے، حالانکہ بتانے والے نے صاف صاف بتا دیا تھا کہ: ”ہل یہدک لقوم الفاسقون“ سے اسی دنیا کی ہلاکت مراد ہے اور فاسق وہی ہے جس نے اسی آب و گل کی دنیا میں جدوجہد ترک کر دی۔

ہندوستان کے مسلم دور حکومت کی چند نامور خواتین

سالنامہ ۱۹۵۵ء کی ترتیب کے وقت بہن کی بیاگرفکل ڈکشنری میں عہد مغلیہ اور بعض دوسرے عہد کی خواتین کے بھی چند نام نظر آئے جن کے تفصیلی حالات تو بہن نے درج نہیں کئے، لیکن ایک ایسی روشنی ان کی شخصیت پر ضرور ڈالی ہے جو افادیت سے خالی نہیں۔

نیاز

- آبدار بیگم = شہنشاہ اکبر کی ایک مشہور کنیز
- اکبر آبادی محل = (اعز النساء بیگم) شاہجہاں کی ایک بیوی۔ فیض بازار دہلی میں سنگ سرخ کی ایک مسجد ۱۶۱۴ء میں اس نے تعمیر کرائی جس میں ۱۵ لاکھ صرف ہوا تھا۔ عالمگیر کے زمانہ میں اس کا انتقال ہوا (۱۶۵۷ء)۔ ایک مسجد اکبر آباد میں بھی اس نے تعمیر کرائی جو شہر کے اندر اکبر آبادی مسجد کے نام سے موسوم ہے۔ آگرہ میں اس نے ایک قصر بھی اپنے لئے تعمیر کرایا تھا۔
- ارجمند بانو بیگم = (ممتاز محل) - شاہجہاں کی نہایت محبوب ملکہ۔ آصف خاں وزیر (نورجہاں کے بھائی) کی بیٹی۔ ۱۶۱۴ء میں پیدا ہوئی۔ شاہزادہ مرزا خیم (شاہجہاں) سے ۱۶۱۴ء میں شادی ہوئی، اس کے بطن سے شاہجہاں کی متعدد اولادیں ہوئیں۔ جب آخری لڑکی دہرآرا پیدا ہوئی تو برہان پور میں اس کا انتقال ہو گیا (۱۶۲۱ء)۔ باغ زین آباد میں دفن ہوئی لیکن بعد کو اسکی لاش آگرہ لائی گئی اور اس مقبرہ میں دفن کی گئی جو آج تاج محل کے نام سے مشہور ہے، اس کو قدسیہ بیگم اور نواب عالیہ بیگم بھی کہتے تھے۔
- ارزانی بیگم = شہر پار کی لڑکی جس کی شادی عہد جہانگیر میں نورجہاں کی لڑکی جہر النساء سے ہوئی تھی۔
- انوپ بانو = جہاندار شاہ کی بیوی اور عالمگیر شانی کی ماں۔
- اودھم بانو = محمد شاہ کی بیوی اور احمد شاہ کی بیٹی۔ جب احمد شاہ تخت نشین ہوا تو اسے نواب بانو اور نواب قدسیہ کا خطاب ملا اور اسکے بھائی مان خاں کو شش ہزاری منصب عطا ہوا۔
- اودیپوری بیگم = اورنگ زیب کی بہت چہیتی بیوی۔ شاہزادہ کام بخش کی ماں۔
- بادشاہ بانو بیگم = جہانگیر کی بیوی ۱۶۱۴ء میں انتقال ہوا۔
- بانو بیگم = وزیر آصف خاں کے بیٹے شاہنواز خاں کی لڑکی جو اورنگ زیب کو بیاہی گئی اور جس کے بطن سے عظیم شاہ پیدا ہوا۔
- بخشی بانو بیگم = شہنشاہ اکبر کی بہن
- بدر النساء بیگم = عالمگیر کی بیٹی۔ ۱۶۱۴ء میں انتقال ہوا۔
- بلال کنور = (زینت محل) - شاہ عالمگیر شانی کی بیوی، شاہ عالم کی ماں۔
- بہار بانو (دولت النساء) اور بیگم سلطان - جہانگیر کی لڑکیاں جنہوں نے کسی میں انتقال کیا۔
- بہار بانو بیگم = جہانگیر کی لڑکی جو دانیال کے بیٹے ظہور کو بہت کسنی میں بیاہی گئی۔

بہو بیگم = نواب آصف الدولہ کی ماں - ۱۸۱۵ء میں انتقال کیا۔

بی بی بانی = محمد شاہ فرمانروائے دہلی کی بہن جو سلیم شاہ سور کو بیاہی گئی اور جس کے بطن سے فیروز پیدا ہوا۔ سلیم شاہ کے انتقال کے بعد جبکہ فیروز بالکل بچہ تھا ایک دن اس کا ماموں محمد شاہ (بی بی بانی کا بھائی) فیروز کو قتل کرنے کے لئے بڑھا تو بی بی بانی نے فیروز کو بچانے کے لئے جو اس کی گود میں تھا خود اپنا جسم اس کی تلوار کے سامنے کر دیا۔ لیکن ظالم ماموں نے اپنے معصوم شیرخوار بھانجہ کو ماں کی گود سے زبردستی چھین کر اس کا ستر تلوار سے قلم کر دیا۔ یہ واقعہ ۱۵۵۴ء کا ہے۔

بی بی دولت شاہ بیگم = شہنشاہ اکبر کی بیوی، شکر النساء بیگم کی ماں۔

بیگم سلطان = کوئی معزز خاتون جس کا مقبرہ اعتماد الدولہ کے مقبرہ کے قریب آگرہ میں پایا جاتا ہے۔ یہ شیخ کمال کی لڑکی تھی اور عہدِ ہمایوں میں اس نے انتقال کیا (۱۵۴۸ء)۔

تاج آرا بیگم = واجد علی شاہ کی ماں جو واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد اپنے بیٹے کی پیروی کے لئے انگلستان گئی۔ فرانس میں انتقال ہوا (۱۷۵۵ء)۔

تارا بیگم = اکبر کی بیوی۔ اس نے آگرہ میں ایک باغ طیار کرایا تھا جو اب ویران ہے۔

جہاں آرا بیگم = شاہجہاں کی بیٹی ممتاز محل کے بطن سے۔ ولادت ۱۶۱۳ء۔ حسن و جمال اور فضل و کمال میں اپنا مثل نہ رکھتی تھی۔ بڑی

ذمی حوصلہ و فیاض خاتون تھی اور موسیقی میں بھی درک رکھتی تھی۔ ۱۶۵۷ء میں وہ ایک رات شاہجہاں کے پاس سے حرم کی طرف واپس آرہی تھی کہ ایک شمع کی لٹ سے اس کے کپڑوں میں آگ لگ گئی اور بڑی طرح جل گئی۔ جسے کہ امید زبیت پاتی نہ رہی۔ آخر کار ایک انگریزی ڈاکٹر GABRIELBOUGHTON سورت سے بلایا گیا اور اس کے علاج سے جانبر ہوئی۔ شاہجہاں نے غیر معمولی انعام و اکرام سے کام لیا اور اس کی درخواست پر ایک فرمان جاری کر دیا کہ اس کے ہرقوم و تاجروں سے ملک بھر میں محصول نہ لیا جائے۔ جہاں آرا نے قلعہ آگرہ سے متصل، ننگ، سرخ کی ایک عالی شان مسجد، لاکھ کے صرف سے طیار کرائی۔ ۱۶۵۸ء میں جب اورنگ زیب اور شاہجہاں کے تعلقات خراب ہوئے اور اورنگ زیب اس فکر میں تھا کہ شاہجہاں کو معزول کر دے تو اس کی بیٹیوں میں صرف جہاں آرا بیگم نے باپ کا ساتھ دیا اور وہ اس سازش میں شریک نہیں ہوئی اور جب شاہجہاں قید کر لیا گیا تو اس نے باپ ہی کے ساتھ آگرہ کے قلعہ میں مقید رہنا منظور کیا۔ جہاں آرا کا انتقال ۱۶۹۲ء میں ہوا جب عالمگیر تخت نشین ہو چکا تھا۔ وہ نظام الدین اولیا میں مدفون ہے اور اس کی قبر پر یہ شعر درج ہے :

بغیر سبزہ بنو شد کسے مزار مرا

کفر پوش غریباں ہمیں گیاہ نہیں امت

جہاں بانو بیگم = اکبر کے بیٹے شاہزادہ مراد کی بیٹی۔ یہ جہانگیر کے بیٹے شاہزادہ پر دینہ کو بیاہی گئی۔ اس مواصلت سے نادرہ بیگم پیدا ہوئی جو داراشکوہ کے عقد میں آئی۔

جودھابائی = راجہ اودے سنگھ جو دھپور کی لڑکی، جہانگیر کی بیوی، شاہجہاں کی ماں۔ شادی سے قبل اس کا نام جگت گوشتائی اور بالمتی

تھا۔ ۱۶۱۹ء میں زہر کھا کر ہلاک ہوئی (آگرہ - ۱۶۱۹ء)۔ موضع سہاگ پور میں دفن ہوئی جسے خود اس نے آباد کیا تھا۔

جیجی بیگم = اکبر کی دایہ، مرزا عزیز کوکا (خانِ اعظم) کی ماں۔ ۱۶۵۹ء میں انتقال ہوا۔ اکبر اس کا جنازہ خود اپنے کندھوں پر لے گیا اور اس کے سوگ میں داڑھی مونچھ منڈا دی۔

چاند بی بی = نظام شاہ اول فرمانروائے احمد نگر کی لڑکی، مفضل نظام شاہ کی بہن اور علی عادل شاہ اول دکنی بیجا پور کی بیوی جب

۱۶۸۸ء میں اس کے شوہر کا انتقال ہوا تو احمد نگر کی حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی اور اسی کے ساتھ بیجا پور کی نگران بھی ہو گئی کیونکہ وہاں کا راجہ عہدِ سلیم عادل شاہ ثانی) جو چاند بی بی کا بھتیجی تھا نابالغ تھا۔ اکبر کے بیٹے شاہزادہ مراد شاہ ۱۶۹۵ء میں

احمد نگر پر یلغار کر کے وہاں کا محاصرہ کر لیا۔ یہ محاصرہ کئی مہینے قائم رہا اور چاند بی بی نے بڑی بہادری سے مدافعت کی۔ جب محاصرہ فوجوں میں رسد کی کمی پڑی تو مراد اور خانخانان نے، چاند بی بی سے صلح کر لی اور ایک معاہدہ آپس میں ہو گیا جس کی رو سے برآر مغلوں کے پاس رہا اور احمد نگر چاند بی بی کے پاس۔ اس کے چار سال بعد ۱۵۹۹ء میں وہ ایک حملہ میں قتل کر دی گئی۔

داجد علی شاہ کی بیوی تھی۔ ایک شخص قربان علی سے جو اس کا رشتہ دار تھا اس کے تعلقات قائم ہو گئے اور دونوں نے شادی کر لینا چاہی۔ لیکن خیر محل لکھنؤ میں رہ کر عقد کرنا پسند نہ کرتی تھی، چنانچہ اس نے چیٹ کشن اور دھ سے حج کرنے کی اجازت لی اور جب وہ اودھ کی سرزمین سے باہر ہو گئی تو قربان علی بھی وہیں پہنچ گیا اور شادی ہو گئی۔ اس کے بعد قربان علی اسے اپنے وطن بجا درے گیا۔

خیر محل =

حمزہ بانو بیگم = شاہجہاں کی بیٹی قندھاری بیگم کے بطن سے۔ ولادت ۱۶۱۷ء

حمیدہ بانو = ملکہ بانو کی بیٹی، ممتاز محل کی بہن، خلیل اللہ خاں کی بیوی وفات ۱۶۶۲ء

خانم سلطان = اکبر کی بیٹی۔ ابراہیم حسین مرزا کے بیٹے مظفر حسین مرزا سے ۱۵۹۳ء میں بیاہی گئی۔

خانہ زاد بیگم = باہر کی بڑی بہن۔ عمر شیخ کی بیٹی۔ اس کی دوسری بہنوں کے نام یہ ہیں: مہر بانو بیگم۔ یادگار سلطان بیگم۔ رقیہ سلطان بیگم۔

دلرس بانو بیگم = مرزا رستم قندھاری کے بیٹے شاہنواز خاں صفوی کی لڑکی۔ اورنگ زیب کی بیوی۔ اس کی ایک بہن عالمگیر کے بھائی شاہزادہ مراد بخش کو بیاہی تھی۔

روشن آرا بیگم = شاہجہاں کی بیٹی۔ ۱۶۱۷ء میں انتقال ہوا۔ اور روشن آرا باغ دہلی میں مدفون ہوئی۔

زیب النساء بیگم = اورنگ زیب کی بیٹی۔ ۱۶۹۹ء میں پیدا ہوئی۔ فارسی کی انشا پر دانہ تھی اور شعر بھی کہتی تھی۔ اس نے اپنے بعد ایک مجموعہ

کلام دیوان مخفی چھوڑا اور قرآن کی تفسیر زیب النساء سیر کے نام سے۔ اس کی شادی نہیں ہوئی۔ ۱۶۹۹ء میں انتقال کیا۔ اسکا مقبرہ کاٹی دروازہ دہلی میں تھا لیکن راجپوتانہ ریلوے ٹکلی تو مسبار کر دیا گیا۔

زینت النساء بیگم = اورنگ زیب کی بیٹی۔ ۱۶۹۹ء میں انتقال ہوا۔ زینت المساجد دہلی کے صحن میں دفن کی گئی جسے خود اس نے طیار کر لیا تھا

سلطانہ رقیہ = اکبر کی سب سے پہلی بیوی۔ اس سے اکبر کی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ آگرہ میں ۸۴ سال کی عمر پا کر انتقال کیا (۱۶۱۳ء)

سلطانہ رضیہ = شمس الدین اتمش کی بیٹی۔ اپنے بھائی رکن الدین فیروہ کی معزولی کے بعد تخت نشین ہوئی (۱۶۲۷ء)۔ ۱۶۲۹ء میں معزول

کرنے تلخ بھٹنڈا میں محبوس کی گئی۔ یہاں سے بھاگ کر اس نے ایک فوج طیار کی اور دہلی پر حملہ کیا لیکن اس کے بھائی بہرام شاہ

نے شکست دے کر قتل کر دیا۔ اس کا مقبرہ دہلی میں ہے۔

سلطانہ النساء بیگم = جہانگیر کی سب سے بڑی بیٹی۔ اس کی ماں راجہ بھگوان داس کی لڑکی تھی۔ ۱۶۹۹ء میں پیدا ہوئی اور اپنے بھائی سلطان خسرو کی

کی وفات پر اندھ آباد میں اس کا مقبرہ تعمیر کرایا۔ اس کا انتقال آگرہ میں ہوا اور اکبر کے مقبرہ کے احاطہ میں مدفون ہوئی۔

سلطانہ بیگم = باہر کی لڑکی۔

سلطانہ بیگم = بھائیوں کے بھائی مرزا عبدال کی لڑکی۔

سلیمہ بانو بیگم = شیخ سینمان کی لڑکی۔ شاہزادہ محمد اکبر (اورنگ زیب کے چوتھے بیٹے) کی بیوی۔ اس کے بطن سے نیکو تیر پیدا ہوا جس نے

آگرہ میں اپنی حکومت کا اعلان کیا اور رکن الدین نے مقید کر دیا۔

سلیمہ سلطانہ بیگم = باہر کی نواسی۔ پہلے میرم خاں سے شادی ہوئی اور پھر خود اکبر نے اس سے عقد کر لیا (۱۶۷۱ء)۔ اس سے ایک لڑکی شاہزادہ

پیدا ہوئی اور ایک لڑکا مراد۔ عہد جہانگیر میں اس کا انتقال ہوا (۱۶۱۱ء)

شاہزادہ خانم = اکبر کی بیٹی سلیمہ بیگم کے بطن سے۔

- شاہ بیگم = جہانگیر کی بیوی - سلطان خسرو کی ماں -
- صالحہ بانو = قاسم خاں کی بیٹی اور جہانگیر کی بیوی، بادشاہ محل اس کا خطاب تھا۔
- فتحپوری محل = (فتحپوری بیگم) شاہجہاں کی بیوی جس نے دہلی میں مسجد فتحپوری تعمیر کرائی۔
- فخر النساء بیگم = نواب شجاع خاں کی بیوی - دہلی کے کشمیری بازار میں اس نے ایک مسجد اپنے شوہر کی یاد میں تعمیر کرائی (۱۱۱۱ھ) جو فخر المساجد کے نام سے موسوم ہے۔
- قندھاری بیگم = مظفر حسین مرزا صفوی کی لڑکی (۱۰۱۹ھ) میں شاہجہاں سے زمانہ ولیعہدی میں اس کی شادی ہوئی۔ آگرہ کے قندھاری باغ میں مدفون ہے۔
- گلچہرہ بیگم = بابر کی بیٹی، ہمایوں کی سب سے چھوٹی بہن - اس کی شادی کابل میں ایک اوزبک شاہزادہ عباس سلطان سے ہوئی (۱۵۵۸ء)
- گلبدن بیگم = بابر کی بیٹی، ہمایوں کی بہن، اکبر کی چھوٹی بہن - یہ خضر خاں سے بیاہی تھی جو شاہان کا شہر کی نسل سے تھا۔ خضر خاں (۱۵۵۵ء) میں گورنر لاہور مقرر ہوا اور اس کے بعد بیٹا کا - (۱۵۶۷ء) میں اس کا انتقال ہوا۔
- گلبرگ بیگم = بابر کی بیٹی -
- گلرخ بیگم = بابر کی بیٹی جو پہلے مرزا نور الدین محمد سے بیاہی گئی اور اس رشتہ سے ایک لڑکی سلیمہ سلطان بیگم پیدا ہوئی۔ سلیمہ کی شادی بیرم خاں سے ہوئی اور بیرم خاں کے انتقال کے بعد خود اکبر نے اس سے عقد کر لیا۔ آثار الامراء میں اس کا نام گلبرگ بیگم لکھا ہے بعض گلبرگ بیگم کہتے ہیں۔
- گلرخ بیگم = کامران مرزا (ہمایوں کے بھائی) کی لڑکی - یہ ابراہیم حسین مرزا (محمد سلطان میرزا کے بیٹے) سے بیاہی گئی۔ ابراہیم حسین مرزا (۱۵۹۱ء) میں قتل ہوا اور اس کا سر اکبر کے پاس آگرہ بھیجا گیا۔ گلرخ بیگم (۱۵۹۳ء) تک زندہ رہی۔
- گننا بیگم = نواب علی قلی خاں (جو چھ اونگلیاں رکھنے کی وجہ سے چھنگا کہلاتا تھا) پنچہزاری منصب دار کی لڑکی تھی۔ یہ پہلے نواب صفدر جنگ کے بیٹے نواب شجاع الدولہ (اددھ) سے منسوب تھی لیکن بعد کو عماد الملک غازی الدین خاں وزیر سے بیاہی گئی اس رشتہ کی وجہ سے صفدر جنگ اور غازی الدین خاں کے درمیان سخت دشمنی ہو گئی۔ اس کا انتقال (۱۱۸۹ھ) میں ہوا۔ دھولپور سے قریب موضع نور آباد میں اس کا بڑا شاندار مقبرہ موجود ہے۔
- یہ اپنے حسن و جمال اور ذہانت کے لحاظ سے خاص شہرت رکھتی تھی۔ وہ شاعر بھی تھی اور سوز، سودا اور سنت سے اصلاح لیتی تھی۔
- گوہر شاہ بیگم = امیر تیمور کے بیٹے مرزا شاہ رخ کی بیوی جسے سلطان ابو سعید مرزا نے ہرات میں قتل کر دیا (۱۵۶۱ء)
- گھسیٹی بیگم = آمنہ بیگم - شہامت جنگ کی بیوی تھی۔ آمنہ بیگم نواب سراج الدولہ کی ماں تھی۔ یہ دونوں بنگال کے مہابت خاں کی لڑکیاں تھیں۔ نواب جعفر علی خاں کے بیٹے میران نے ان دونوں کو دریا میں غرق کر دیا۔ (۱۷۷۷ء)
- لاڈلی بیگم = شیخ مبارک کی بیٹی، ابوالفضل کی بہن - (۱۱۸۹ھ) میں نواب اسلام خاں گورنر بنگال سے بیاہی گئی۔ آگرہ میں انتقال ہوا اور اپنے باپ کے قبرستان میں دفن ہوئی۔ روضہ لاڈلی اس کی قبر کا نام ہے۔
- لطیف النساء بیگم = سراج الدولہ نواب بنگال کی بیوی۔ جو نواب جعفر علی خاں کے عہد میں دوسری خواتین کے ساتھ ۱۷۷۷ء میں قتل کر دی گئی۔
- ماد بانو = خان اعظم کوکا کی بہن اور عبدالرحیم خانخاناں کی بیوی (۱۱۸۹ھ) میں انتقال ہوا۔
- ماہ چوچک بیگم = ہمایوں کی بیوی اور شاہزادہ فرخ خاں کی ماں۔
- ناہم بیگم = شیخ احمد جام کی بیٹی، بابر کی بیوی، ہمایوں کی ماں - (۱۵۶۷ھ) میں پُرانی دہلی کے قلعہ کے قریب اس نے ایک مسجد تعمیر کرائی

جبکہ اس کی عمر ۷۰ سال کے قریب تھی۔

- مریم مکاری = اکبر کی ماں حمیدہ بانو بیگم کا لقب۔
- ملکہ جہاں = جہانگیر کی بیوی۔ جیسلمیر کے راجہ راجہ بیگم کی بیٹی۔
- ملکہ جہاں = حسین شاہ شترقی فرارندے جو پور کی بیوی۔
- ملکہ زمانی = شاہ فرخ سیر کی بیٹی۔ ۱۱۳۵ھ میں محمد شاہ سے بیاہی گئی۔ کابلی دروازہ دہلی کے پاس مدفون ہے۔
- ممنی بیگم = میر جعفر نواب بنگال کی حرم۔ میر جعفر اور اس کے دو جوان لڑکوں کی وفات کے بعد دارن ہنگنر وایسے نے اسے میر جعفر کے نابالغ بیٹے مبارک الدین کا دلی ونگراں مقرر کیا۔ اس کے بطن سے بھی ایک لڑکا نجم الدولہ پیدا ہوا۔ اس کا انتقال ۱۱۳۹ھ میں ہوا۔
- موتی بیگم = شاہجہاں کی بیوی۔ اس نے آگرہ میں راج گھاٹ کے قریب ایک باغ طیار کرایا تھا جو اب بالکل ویران ہے۔
- مہر النساء بیگم = عالمگیر کی پانچویں بیٹی۔ اس کی ماں کا نام اورنگ آبادی محل تھا۔ ۱۱۴۱ھ میں پیدا ہوئی، سلطان مراد بخش کے بیٹے شاہزادہ ایزد بخش سے بیاہی گئی ۱۱۴۲ھ میں انتقال کیا۔
- مہر النساء بیگم = شیر افگن خاں کی بیٹی نور جہاں کے بطن سے۔ جہانگیر کے سب سے چھوٹے لڑکے شہر بار سے بیاہی گئی۔
- نادرہ بیگم = جہانگیر کے بیٹے سلطان پر دینر کی لڑکی جو ۱۱۴۳ھ میں داراشکوہ سے بیاہی گئی جس سے سلیمان شکوہ اور سپہر شکوہ پیدا ہوئے۔
- نظام بائی = ۱۱۴۹ھ میں انتقال ہوا۔ لاہور کی خانقاہ میاں میر میں دفن کی گئی۔
- نور جہاں بیگم = بہادر شاہ کی بیوی، جہاندار شاہ کی بیٹی۔
- نور جہاں بیگم = جہانگیر کی محبوب ملکہ۔ اعتقاد الدولہ کی بیٹی۔ جہانگیر ابتدا ہی سے اس کی طرف مایل تھا، لیکن اکبر نے اس کی توجہ ہٹانے کے لئے شیر افگن خاں گورنر بنگال سے اس کی شادی کر دی۔ اکبر کے انتقال کے بعد جہانگیر نے اپنے رضاعی بھائی قطب الدین خاں کو گورنر بنگال مقرر کیا۔ شیر افگن خاں نے اسے ہردوان میں قتل کر دیا اور پھر قطب الدین خاں کے ساتھیوں نے شیر افگن خاں کو بھی ہلاک کر دیا۔ اس کے بعد نور جہاں قیدی کی حیثیت سے دلی لائی گئی اور ۱۱۴۹ھ میں جہانگیر نے اس سے عقد کر لیا اور اس کا نام مہر النساء کی جگہ نور جہاں رکھا۔ اس کو جہانگیر کے مزاج میں اتنا درخوڑ ہو گیا کہ حکومت کے نظم و نسق میں اس کا دخل ہو گیا، اور اس کے نام کا سکہ بھی جاری کیا گیا، اس کا باپ مرزا غیاث کو اعتماد الدولہ کا خطاب دیکر وزیر بنایا گیا اور اس کے دو بھائیوں کو درجہ اول کا امیر کر دیا گیا۔ جہانگیر کی وفات پر وہ اٹھارہ سال زندہ رہی اور شاہجہاں نے گرانقدر نشین اسکی مقرر کر دی۔
- ہوشمند بیگم = اس نے ۷۲ سال کی عمر پائی۔ ۱۱۵۵ھ میں بمقام لاہور انتقال کیا اور وہیں مقبرہ جہانگیر کے پاس اس کا مقبرہ تعمیر ہوا۔
- سلطان خسرو کی لڑکی = شاہزادہ ہوشنگ (دانیال کے بیٹے) سے ۱۱۳۵ھ میں اس کی شادی ہوئی۔

ملک خطا کے شہزادے

دسی احمد بلگرامی کا وہ مشہور مقالہ جس میں انھوں نے اپنے مخصوص انداز بیان میں مسئلہ حرمت خمر پر مولانا شبلی مرحوم کی تحریر پر اعتراض کیا تھا اور اڈیٹر نگار نے اس پر تبصرہ کیا تھا قیمت بارہ آنے۔

منہج نگار

توقیت

تاریخ اسلامی ہند کی ترتیب کے سلسلہ میں اڈیٹر نگار نے یہ توقیت مرتب کی تھی۔ جس میں ۱۵۳۲ء تک کی تمام اہم تاریخی واقعات بقید سنہ عیسوی لکھا کر دئے گئے ہیں تاریخ کے طلباء کے لئے بڑی کارآمد چیز ہے۔ قیمت ایک روپیہ۔

منہج نگار

معلومات

رنگوں کی موسیقی جس طرح جامع کولمبیا (امریکہ) کے استاد علم الکیمیا ڈاکٹر گولڈ نے مختلف لگہنوں کو ملا کر عطریات کی موسیقی پیدا کی ہے اسی طرح ایک مشرقی الاصل خاتون میری بالوک گرنیوالڈ نے (جولہائی الاصل ہے) رنگوں کی موسیقی پیدا کر کے حد درجہ ذہانت کا ثبوت دیا ہے۔

اس وقت تک فنونِ جمیلہ صرف پانچ تسلیم کئے جاتے تھے۔ شعر موسیقی، مصوری، بہت سازی اور مہندستہ انبواء (فنِ عمارت سازی) لیکن اب خاتون مذکور نے اس میں موسیقی الوان کا بھی اضافہ کیا ہے۔ جس طرح عام موسیقی کانوں کے لئے ایک خاص قسم کی لذت پیدا کرتی ہے، اسی طرح موسیقی الوان کا مقصود یہ ہے کہ وہ آنکھوں کو مسرور کرے۔ خاتون مذکور نے ایک نہایت ہی دقیق الصنعت آلہ (جسے وہ آرگن ارغون کہتی ہے) ایجاد کیا ہے جو پیانو کی طرح مختلف پردوں (KEYS) پر ہاتھ رکھنے سے مختلف قسم کی رنگین روشنیاں پیدا کرتا ہے جو باہر گراستھر مناسب ہو کر نکلتی ہیں کہ اس سے باصرہ اتنا ہی لطف حاصل کرتا ہے جس قدر کہ عام موسیقی سامعہ۔

اس خاتون نے امریکہ کی ایک مجلس عام میں اس آلہ کا تجربہ بڑے بڑے ماہرین فن کو دکھایا اور سب نے بالاتفاق اس کی تکمیل کو تسلیم کر لیا اس جماعت کے ایک شخص کا بیان ہے کہ ”جس وقت میں تاریک حجرہ میں داخل ہوا، اس وقت کوئی مذہبی گیت گایا جا رہا تھا۔ چنانچہ اس گلے کے ساتھ سب سے پہلے میں نے آسمانی رنگ کی روشنی دیکھی جو موسیقی کی بمندی و پستی کے ساتھ ساتھ کم زیادہ ہوتی تھی۔ جب گیت میں جذبات شجاعت ظاہر کرنے والے الفاظ گائے جانے لگے تو روشنی دفعۃً سرخی میں تبدیل ہو گئی اور یہ معلوم ہونے لگا کہ گویا خونیں شفق نمودار ہو گئی ہے ان غرض اسی طرح ہر جذبہ کے لحاظ سے مختلف روشنیاں پیدا ہوتی تھیں اور اس میں اس قدر نازک تاریخ کے ساتھ کمی بیشی پیدا ہوتی تھی کہ مشکل سے اس کا امتیاز ہو سکتا تھا“

یہ آلہ اس قدر نازک ہے کہ اس کے ذریعہ سے ایک رنگ ۲۰ قسم کے ہلکے اور گہرے انداز سے پیدا کیا جاسکتا ہے۔

ستاروں کے اندر آثارِ حیات آپ نے اکثر اوقات کے وقت دیکھا ہوگا کہ آسمان کی طرف سے ایک روشن ہوائی زمین کی طرف آتی ہوئی نظر آتی ہے اور پھر غائب ہو جاتی ہے۔ عام لوگ اسے ”ٹوٹے ہوئے ستارہ“ سے تعبیر کرتے ہیں اور پڑھے لکھے آدمی ”شہاب ثاقب“ کہتے ہیں۔

یہ منور چیز حقیقتاً ٹکڑا ہوتا ہے کسی ستارہ کا جسے زمین اپنی طرف جذب کرتی ہے۔ جس وقت یہ ٹکڑا ستارہ سے جدا ہوتا ہے، بالکل سرد اور غیر منور ہوتا ہے، لیکن جب زمین کے قریب آ جاتا ہے تو ہوا سے ٹکرا کر مشتعل ہو جاتا ہے اور ہمیں آتش بازی کی ہوائی کی طرح نظر آتا ہے۔

دنیا کے اکثر عجائب خانوں میں اس قسم کے ٹکڑے موجود ہیں اور علماء ان کی کیمیائی اور میکانیکی تفصیل کر کے یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ جن ستاروں کے یہ ٹکڑے ہیں وہ کن عناصر سے مرکب ہیں اور وہاں کسی ذی حیات کا پایا جانا ممکن ہے یا نہیں۔ سب سے پہلے وہ شخص جس نے اس طرف توجہ کی اور شہرت حاصل کی ایک جرمنی عالم ہاين تھا۔ اس نے ایک ٹکڑے کا اس قدر دقیق مطالعہ کیا کہ وہ اس کے نام سے ہاين مشہور ہو گیا۔ اس عالم کی رائے میں (جس سے اب تمام علماء متفق ہیں) جس ستارہ کا یہ ٹکڑا ہے وہاں آسٹریچ۔ بکری گھاس اور مرجان وغیرہ دیباہی کپڑے پائے جاتے ہیں۔

اس کے بعد دوسری جیسی عالموں نے تحقیق شروع کی اور اس نتیجے پر پہنچے کہ تمام اُن کوکب میں جن کے ٹکڑے ٹوٹ ٹوٹ کر زمین کی طرف آتے ہیں، کوئلہ، آکسیجن اور پانی کا وجود پایا جاتا ہے اور فضا کے ٹکڑوں کا معائنہ کیا گیا اُن سے یہ ثابت ہوتی ہے کہ اُن کے کوکب میں کسی وقت حیات ضرور پائی جاتی تھی۔

امریکہ کے ایک فلکی نے لکھا ہے کہ کوکب سے (مثلاً عطارد و زہرہ) زمین پر بعض امراض کے جراثیم منتقل ہونا بہت محتمل ہے۔ اس عالم نے یہ بھی خیال ظاہر کیا ہے کہ عطارد میں حیات کا ثبوت نہیں ملتا، کیونکہ وہ بالکل سرد کرہ ہے۔ البتہ زہرہ کے اندر بعض ایسے جراثیم کا ہونا معلوم ہوتا ہے جو زمین میں پائے جاتے ہیں۔ یہ جراثیم زہرہ کی فضا میں منتشر ہیں اور وہاں فنا ہوتے رہتے ہیں، لیکن ان میں سے بعض جراثیم شعاع آفتاب کے ساتھ (جس کے اندر بہت سے خلا یا پائے جاتے ہیں) زمین تک پہنچ جاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی زمین پر ایسے عجیب و غریب امراض دفعہ رونما ہو جاتے ہیں جن کا کسی کو علم نہیں ہوتا، پھر چونکہ زہرہ کا آفتاب و زمین کے درمیان سے عبور کرنا ثابت ہو چکا ہے اس لئے ان جراثیم کے منتقل ہونے کا احتمال اور قوی ہو جاتا ہے۔

اگر یہ نظریہ صحیح مان لیا جائے تو اس کے ساتھ یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہماری زمین کے کبھی جراثیم دوسرے کرورں میں پہنچتے ہیں اور وہاں کی ذی حیات اشیاء بھی قریب قریب ایسی ہی ہوں گی جیسی زمین پر پائی جاتی ہیں۔ لیکن یہ اُسی وقت تسلیم کیا جاسکتا ہے، جب انہیں تحقیق کے مطابق آفتاب کی روشنی کو ایک وزنی محسوس چیز سمجھا جائے، کیونکہ جب تک اس کو مادی چیز تسلیم نہ کیا جائے اس کے ذریعہ سے جراثیم کا ادھر سے اُدھر منتقل ہونا محال ہے۔

ربڑ کے دو بینی شیشے اہل مغرب نے یونٹورنیا کی ہر چیز کا کوئی نہ کوئی مصروف تلاش کر لیا ہے، لیکن خصوصیت کے ساتھ ربڑ اور آکسیجن سے جس قدر کام لیا جا رہا ہے وہ نہایت عجیب و غریب ہے۔

حال ہی میں یورپ کے ایک مخترع نے ربڑ کو شفاف بنا کر سائنس کی دنیا میں لمبل ڈال دی ہے اور اپنی اپنی جگہ ہر شخص اس کا مصروف سوچنے میں مجبور کرتا ہے، لیکن سب سے زیادہ اہم علمی خدمت جو اس شفاف ربڑ سے لی جانے والی ہے، وہ دو بینی شیشے طیارہ کرتا ہے۔ اس وقت رصدگاہوں میں بڑی بڑی دوربینیں موجود ہیں اور ان میں بڑے بڑے محدب شیشے لگے ہوئے ہیں، جنہیں انگریزی میں لنس (اور عربی میں عدسات کہتے ہیں، لیکن ابھی تک دوربینیں ناقص ہیں اور دور کے اجرام فلکی کا حال اُن سے بالکل نہیں معلوم ہوتا، اس کا سبب صرف یہ ہے کہ محدب شیشے بہت وزنی ہوتے ہیں اور اس لئے ان کا حجم نہیں بڑھایا جاسکتا۔ لیکن اب ربڑ کے شفاف ہو جانے سے لنس اسی کے بنیں گے اور چونکہ وہ ہلکا ہوتا ہے اس لئے جس قدر دبیرہ عظیم چاہیں گے بنا سکیں گے، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہیئت میں غیر معمولی اکتشافات کا اضافہ ہو جائے گا اور بہت سے غیر مرئی سیاروں کے حالات ہمیں آسانی سے معلوم ہو جائیں گے۔

وہ لوگ جو مریخ کے حالات معلوم کرنے کے لئے زیادہ بیتاب رہتے ہیں اُن کو اب اپریل فول کے سلسلہ میں وہاں کی معلومات حاصل نہ ہوا کرے گی، بلکہ مشاہدات کی بناء پر اس عجیب و غریب کرہ کی تمام کیفیت واضح ہو جائے گی اور بالکل ممکن ہے کہ ایک دن وہاں کے مناظر کے پچھلے پوسٹ کارڈ (تصویری کارڈ) عام طور سے بازار میں آجائیں اسی کے ساتھ یہ اختراع یورپ کی عبس لطیف کے لئے بھی ایک برکت ثابت ہوگی، کیونکہ فی الحال سینہ، بازو اور پنڈلیاں کھلی رکھنے میں کبھی کبھی سردی کا خیال مانع آ جاتا ہے لیکن جب ربڑ شفاف ہو گیا تو پھر اندیشہ بھی نہ رہے گا اور نہایت آزادی کے ساتھ وہ سردی سے متاثر ہوئے بغیر اپنی عریانی کو قائم رکھ سکیں گی۔

کیا دن طویل ہو رہا ہے زہرہ کے کرہ میں دن ۹۰ گھنٹوں کا ہوتا ہے، ماہرین ہیئت کا بیان ہے کسی وقت زما ماضی میں جب زمین زیادہ سرعت کے ساتھ گردش کرتی تھی تو اس کا دن صرف بارہ گھنٹے کا ہوتا تھا لیکن اب مرد ایام سے جس قدر اس کی حرکت کم ہوتی جاتی ہے دن بھی بڑھتا جاتا ہے۔

زمین کی حرکت کم ہونے کے متعدد اسباب ہیں، ان میں سے ایک خاص سبب، زمین کے سمندروں میں تار کا پیدا ہونا ہے جو

شمس و قمر کی کشش سے رونما ہوتا ہے، دوسرا سبب دیگر سیاروں سے شہاب ثاقب کا زمین پر گرنا ہے جس سے زمین کا ثقل بڑھتا جاتا ہے اور اس کی حرکت بطی ہونے کی وجہ سے دن طویل ہو رہا ہے۔ نیوٹن کا اندازہ تھا کہ ۲۴ گھنٹے میں ایک کروڑ شہاب ثاقب زمین پر گرتے ہیں، جن میں سے اکثر مشتعل ہو کر گیس میں تبدیل ہو جاتے ہیں تاہم زمین کا ثقل ان سے بڑھتا رہتا ہے۔

ابھی تو نہیں لیکن بہر حال اک زمانہ آنے والا ہے جب دن کی طوالت بین طور پر محسوس ہو سکے گی، یہاں تک ایک دن پورا ایک مہینہ کا ہو جائے گا اور اس وقت چاند اک چھوٹے ستارہ کی طرح ہر وقت نظر آتا رہے گا۔

ٹھنڈی روشنی ایک زمانہ ہے یہ کوشش جاری ہے کہ کسی طرح روشنی بغیر حرارت کے حاصل کی جائے، کیونکہ جب کسی چراغ کو روشن کرتے ہیں تو اس کی قوت کا صرف پانچواں حصہ روشنی کا کام دیتا ہے باقی چار حصے حرارت پیدا کرنے میں صرف ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اس غرض کے لئے بعض ایسے کیڑوں، دریائی جانوروں کی طرف مبذول ہوئی ہے جن سے ٹھنڈی روشنی پیدا ہوتی ہے، حال میں امریکہ کے ایک ماہر وظائف الاعضاء ہاروی نے بعض ایسے بھری کیڑوں اور مچھلیوں کو جمع کر کے خشک کیا اور ان کے سفوف میں پانی ملانے سے سبزی مائل آسمانی رنگ کی روشنی پیدا ہوئی، جس میں ایک انسان آسانی سے پڑھ سکتا ہے۔

پروفیسر مذکور کا بیان ہے کہ ان حیوانات کے منور ہونے کا سبب یہ ہے کہ ان میں ایک خاص قسم کا مادہ نو سیفرین پیدا ہوتا ہے اور جو آکسیجن کے ساتھ مخلوط ہونے کے برخلاف دوسرے مادوں کے بہت دیر تک جلتا رہتا ہے، ان کیڑوں اور جانوروں میں یہ روشنی اس وقت پیدا ہوتی ہے، جب نہیں کوئی خطرہ پیش آتا ہے اور اس روشنی میں وہ ادھر ادھر بھاگ جاتے ہیں۔

جاپان اور میکسیکو میں ایسے کیڑے کثرت سے پائے جاتے ہیں اور لڑکے لڑکیاں انھیں زینت کے لئے بکثرت اپنے ملبوس میں لگا لیتے ہیں۔ معمولی لکڑیوں کا فرنیچر (اثاث) جب طیار ہوتا ہے تو لوگ اپنے ذوق کے مطابق مختلف رنگوں سے رنگتے ہیں۔

درختوں کا رنگنا اہل جرمنی نے اس وقت کو محسوس کر کے کوشش کی ہے کہ وہ درختوں کی لکڑی میں طبعی طور پر وہی رنگ پیدا کر دیں جن کی بعد کو ضرورت ہوتی ہے، چنانچہ انھوں نے اس غرض کے لئے بعض درختوں پر تجربہ کیا اور اس میں کامیابی حاصل کی۔ انھوں نے چھوٹے چھوٹے ظروف رنگین مادہ سے بھر کر ادھر ادھر درختوں میں ٹکا دئے اور چھوٹی چھوٹی ٹالیوں کے ذریعہ سے جڑوں تک اس مادہ کو پہنچا دیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چار ہفتہ میں لکڑی کا رنگ بالکل بدل گیا اور ان سے جو فرنیچر طیار ہوا اس کو پھر رنگنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

جس وقت آفتاب کی روشنی منشور بلوری (بلور کے سہ پہل ٹکڑے میں تحلیل ہوتی ہیں تو ہمیں سات رنگ نظر آتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ سات رنگ کی شعاعیں

بینائی زایل کر دینے والی شعاعیں الگ الگ ہم تک پہنچتی ہیں۔ چنانچہ انھیں سات رنگ کی شعاعوں میں ایک شعاع ایسی بھی ہوتی ہے جس کا رنگ "فوق بنفسجی" (یعنی بنفسجی رنگ کی شعاعوں سے اوپر کا) کہلاتا ہے۔

یہ شعاع جس طرح مسئلہ حیات میں بہت موثر ہے اسی طرح ضعف نظر و ذرا بصارت کا باعث بھی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر کریبا کا بیان ہے کہ یہی وہ شعاعیں ہیں جو آنکھ کے لنس (عدستہ العین) کو غیر شفاف بنا کر نگاہ کو ضعیف کر دیتی ہے۔

چونکہ آنکھ کا لنس ایک جامد چیز ہے جس کا تعلق عصاب سے بالکل نہیں ہے اس لئے ان شعاعوں کی وجہ سے جو دھندلا پن پیدا ہوتا ہے اسے طبیعت انسانی دور نہیں کر سکتی۔ ڈاکٹر موصوف کے اس نظریہ کی تصدیق اس سے بھی ہوتی ہے کہ آنکھ کے لنس میں دھندلا پن ہمیشہ سچے کی طرف سے شروع ہوتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ روشنی جب آنکھ کی طرف پہنچتی ہے تو وہ ہمیشہ اُلٹی ہوتی ہے۔ یعنی اس اصول کی بناء پر اس رنگ کی شعاعیں ہمیشہ لنس کے نیچے حصہ پر پڑتی ہیں۔

ملک رام صاحب ام، اے کی مشہور مورخانہ کاوش کا نتیجہ ہے جس میں انھوں نے عورت کی زندگی کے ہر پہلو پر اسلامی نقطہ نظر سے گفتگو کی ہے۔ قیمت تین روپیہ۔ منیجر نگار لکھنؤ

عورت اور اسلام

لکیر

پروفیسر شورشور (علیگ)

آندھیاں شمع پر ہیں دام فگن
 برق کے منتظر ہیں کا شانے
 دود سا ماں ہیں خردی کے چراغ
 شعلہ آتشیں سے اُجھے ہیں
 صرصر انقلاب کی زد پر
 بارِ مسند ہے یوں شہنشاہی
 یوں ٹھنکتا ہے صبح کا ماسکتا
 ٹوٹنا برق کا مقتدر ہے
 اے گرفتارِ لاد و ندریں
 لاکھ ماتھوں پہ ہونشانِ سجود
 نگہ و منکر کی تمازت میں
 ہوتے ہیں کتنی ظلمتوں کے محل
 پھر بھی ظلمات کے کیچے کو
 ایک نازک کرن کی جنبش سے
 بڑھ کے رکتا نہیں کوئی سیلاب
 شب کے ماتھے پہ صبح کا سورج
 آج بھی منکر کے یتیموں میں
 میری تختہ پل کا اُجالا دیکھ
 خطِ تصویر کھینچنے والا

ہے اندھیرا حریفِ بدرِ منیر
 تیر کی جستجو میں ہیں نچپیر
 اُٹھ رہا ہے جنازہ جاگیر
 کھل اطلال و قبائے حرمیر
 جل رہا ہے چراغِ منعم و میر
 جیسے شعلوں کے دوش پر شہتیر
 سینہ شب میں جیسے صبح کا تیر
 ہے یہ پھولوں کی آخری تقدیر
 دیکھ اپنی نگاہ کی زنجیر
 چشمِ آدم سے جھانکتا ہے ضمیر
 چھوٹ جاتی ہے جہل کی نکسیر
 آفتابوں کے خون سے تعمیر
 چیر جاتا ہے آفتاب کا تیر
 ٹوٹ جاتی ہے رات کی زنجیر
 ہوں چٹانیں ہزار دامن گیر
 کھینچتا جا رہا ہے ایک لکیر
 ”زلزلہ و کاکل“ کی بج رہی ہے نفیر
 ذرہ ذرہ ہے تابشوں کا سفیر
 مسکراتا ہے خود پس تصویر

میرے ماحول میں مری آواز

بادلوں پر ہے برق کی تھریر!

انبلیس سے ایک ملاقات

(فضا ابن فیضی)

شام اور سحر اور ہے سودا اور زیاں اور "مومن کا جہاں اور ہے کافر کا جہاں اور"

کیا تیرے جہاں میں بھی سم افشاں ہے یہی جہوت

اے ساحر لاہوت !

اس دور میں کیا ہیں ترے حالات کم و بیش ہو گا ترا ہر اک نفس آلودہ صد نیش،

ہے ماڈر دہرہ انجسیر نہ شہتوت

اے ساحر لاہوت !

جنت سے نکل کر تجھے اس آئی یہ دنیا یہ ابر و لب کشت یہ کہسار یہ دریا

کچھ کم نہیں فردوس سے یہ خطہ ناسوت

اے ساحر لاہوت !

گو دل کش و فوجیز دنیا ہے حسیں ہے پھر بھی جو اسے دیکھے آباد نہیں ہے

آئینہ بھی حیرت میں ہے نگہیں بھی ہے مہوت

اے ساحر لاہوت !

کیوں محفل امروز چراغوں سے ہے ہزار کیوں فصل بہاراں میں سلگتے ہیں سمن زار

انسان ہے انسان کے لئے فتنہ ہاروت

اے ساحر لاہوت !

پیماہ خورشید پہ ہے مہر سیاہی صاحب نظری شیوہ افسردہ نگاہی

ہیں دوش پہ کار آگہی و فکر کے تابوت

اے ساحر لاہوت !

مفلوج ہے قرون سے دل اسکا نظر اس کی بے مایہ ہے دنیا میں شب اس کی سحر اس کی

کنگرے بھی کم مایہ ہے یہ دانہ یا قوت

اے ساحر لاہوت !

اُس خواب ازل کی نہیں تعبیر "مومن" ہر ایک سفینہ میں ہے طوفان متکون،

پیدا تو کریں آج کے یوتھ دہن حوت

اے ساحر لاہوت !

ارباب سیاست کی تمنا ہی بر آئی انسان کو لے ڈوبی تمدن کی خدائی

تجھ سے بھی غضبناک ہیں انسان کے کروت

اے ساحر لاہوت !

آذر کی براجم نے کی پشت پناہی فرعون کے حق میں ہوئی موسیٰ کی گواہی

اب تجھ سے گلہ مند نہیں عالم ناسوت

اے ساحر لاہوت !

امید موہوم

(نور جہاں نصرت)

تم نے کیوں آج مرا دائے غم دل چاہا،
 قلب محزون کو مرے یونہی سسکنے دیتے!
 خوب ہوتا جو جلا دیتے مری کشتِ حیات
 آتشِ غم کو ذرا اور بھڑکنے دیتے!
 غم جانسوز کو سینے میں چھپا کر اے دوست!
 میں نے امید کا ہر نقش مٹا رکھا تھا
 لوٹ لی تھی غم دنیا نے تمناے حیات
 دل نے تجھ کو، تری یادوں کو بھلا رکھا تھا!

تلخیِ زیست سے دل میرا فسردہ تھا مگر،
 مجھ کو تسکین دلِ زار کی حسرت ہی نہ تھی
 ہر نفس میں مرے آہوں کا ڈھواں تھا لیکن
 غم ہستی سے مجھے کوئی شکایت ہی نہ تھی!

دل کوئی راہ سے بھٹکا ہوا راہی ہے جسے
 ہر نئے گام پر منزل کا گماں ہوتا ہے
 کاش سایہ کی تمنا نہ کرے دل میرا
 کہ ہر اک نخل یہاں برگِ فشاں ہوتا ہے!

پریش غم سے مرے زخموں کو چھیڑا تم نے
 آج بھر ہونے لگا دل میں خیالوں کا ہجوم،
 تیرگی ہو چلی کا فورنگا ہوں سے مری،
 دل کو بھلانے لگی کوئی امید موہوم!

تفسیری غزل: (سید حکیم احمد صاحب)

کس لئے کہتے ہو ایسی بات "مالا تفعلمون"
 تم ہو حورو خلد و رضواں کے پجاری واعظو
 بیدھڑک چلتے ہیں راہ عشق پر اسے شیخ ہم
 بھول جانے کے طریقے تم کو صد ہا یاد ہیں
 اس طرف چشم عنایت۔ اس طرف چشم عقاب
 حسن والو اپنی جانب کھینچتے ہو کیوں مجھے
 یاد آیا کچھ تمہیں اپنا کہا اے اہل عرش
 ظلم اپنی ذات پر ممکن ہے اپنے فعل سے
 خازنِ جنت ہیں یہ۔ یہ مخزنِ اسرارِ غیب

کس لئے کرتے ہو ایسا کام "مالا تفعلمون"
 میں ہوں اور یادِ صنم "لا اعبد ما تعبدون"
 جا نہیں سکتے ہو تم کعبہ کو "إلا فاعلمون"
 کیا کہیں تم سے کہ "اقررتم و انتم تشہدون"
 ساری دنیا دیکھتی رہتی ہے "عما تفعلمون"
 کیا غلط ہے یہ کہ "انتم ہا اولاء تفتلون"
 جب فدا ہونے لگے عاشق "وانتم تنظرون"
 دوست کو دشمن ہی سمجھا تم نے "انتم ظالمون"
 "اللذین یوقنون۔ واللذین یؤمنون"

شاعر جاں سوختہ مجنوں ولا یعقل نہیں
 اُس کے دردِ دل کا اک قصہ ہے "مالا تفعلمون"

شفقت کاظمی (ہطرز حسرت)

نہ کریں شکوہ بیداد گوارا نہ کریں
 لب پہ آئی ہے جو فریاد تو برہم کیوں ہو
 تجھ کو منظور نہیں ہم سے جو پیمان ونا
 کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ بایں خواہش وید
 دل پس از ترک تمنا بھی مچل جاتا ہے
 بات اربابِ وفا کی جو کہیں چل نکلتے

ہم کوئی بات علی الرغم تمنا نہ کریں
 یوں بھی کیا دردِ محبت کا برا دانہ کریں
 کیا کریں اور اگر ترک تمنا نہ کریں
 ہم ترے جلوہ رنگیں کا نظارہ نہ کریں
 وہ نگاہ کی نظر سے مجھے دیکھا نہ کریں
 غیر ممکن ہے کہ ہم ذکر تمہارا نہ کریں

حیاتِ لکھنوی

فلّ آشیاں تھا نصیبوں میں آج کنجِ قفس
 اس التفاتِ ساسل کی کیا ضرورت ہے
 نظر میں ہے تری شانِ ستم کی تصویر
 خیال تھا کہ دم واپس وہ آئیں گے

یہ زندگی کبھی دو دن بھی ایک سی نہ رہی
 وفورِ دردِ محبت ہیں اب کبھی نہ رہی
 جدا وہ تیرے تصور سے دو گھڑی نہ رہی
 حیاتِ آج وہ امیدِ آخری نہ رہی

نسیم شاہجہا پوری:

زباں تک اپ نہیں آتے ہیں غم کے افسانے
 تری نگاہ نے کی میری دلدہی اکثر
 نہ التفات کی حسرت نہ آرزوے کرم

یہ کیا ہوا دل بیتاب کو خدا جانے
 یہ طرزِ پرستش خاموش کوئی کیا جانے
 اب ان حدوں سے کچھ آگے ہیں تیرے دیوانے